کوئی دیکھ نہ لے
جاوید صبا

ہم وہ درویش سخن گو کہ فضیلت کے لئے

آپ سے خلعت و دستار نہیں چاہیے ہے

سرورق : جیکسن پولاک

تزئین و آرائش : عرفان شایان

عکس شاعر : پارس مسرور، بدر آرٹسٹ

پروف ریڈنگ : خالد معین

ترتیب و انتخاب : قیصر منور

اشاعت اوّل : جولائی ۲۰۱۲

اشاعت دوم : فروری ۲۰۱۳

پرنٹر : خرم پرنٹنگ پریس

قیمت : ۵۰۰ روپے

امریکہ، کینیڈا : ۲۰ ڈالر

برطانیہ : ۱۵ پاؤنڈ

انتساب

اپنی شریک حیات صوفیہ نیلم کے نام
جس نے تضمین، دانیال، شہیر اور ماہم کی
بہترین تربیت کی اور مجھے بھی برداشت کیا

آخری شمع بھی بجھ جائے گی تب بولو گے

بولو ! اب بھی نہیں بولو گے تو کب بولو گے

فہرست

میرا سوچا ہوا

اپنی شاعری کے بارے میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں ، اس کشمکش نے بہت دن اُلجھاوے میں رکھا۔ کتاب کا مسودہ مارچ میں اشاعت کے لیے تیار تھا کہ ایسے میں ایک بے دلی نے دل و دماغ کو ایسا آ جکڑا کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس مجموعہء کلام کی اشاعت سے کون سا میرے سرخاب کے پَر لگ جائیں گے اور کون سا میری عزت و توقیر میں اضافہ ہو جائے گا۔ یہ کیفیت تا دمِ تحریر مجھ پر طاری ہے اور اگر آج کتاب کی اشاعت کے بارے میں قیصر منور کا تشویش ناک فون نہ آتا تو شاید میں یہ چند سطور بھی نہ لکھ پاتا 'کوئی دیکھ نہ لے' میرا دوسرا مجموعہء کلام ہے جو 'عالم میرے دل کا' کے لگ بھگ ۲۲ برس بعد شائع ہو رہا ہے ۔ مجھ سے یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے مجموعہ میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی اور زمانے کے چلن کے مطابق اب تک پچاس ساٹھ

کتابیں شائع کیوں نہیں ہوسکیں۔اس سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے
کہ مزاج کی کجی نے مجھے اپنے آپ سے باہر نکلنے ہی نہیں دیا۔شدید
معاشی الجھنوں کے باوجود ضمیر کو مقدم رکھنے کی آرزو میں ملازمتوں
کوٹھکرانا پڑااور زندگی کی گاڑی بغیر ایندھن کھینچنے کی عادت ڈالنی پڑی
۔یہاں تک کہ 'مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں'۔میری ہمیشہ
یہی کوشش رہی کہ عالم مرے دل کا کوئی دیکھ نہ لےمگر اپنی کیفیات کو
سات پردوں میں چھپانے کے باوجود شاعری نے مجھے بے نقاب
کردیااور دوسرے مجموعہ کی اشاعت کا فیصلہ کرنا ہی پڑا۔میری شاعری
کاخمیر کس آگ سے گوندھا گیا ہے' میرے خوابوں کی دنیا خوبصورت
ہے کہ نہیں اور مجھ میں شاعری کی صلاحیت کس درجے پر فائز ہے' اس
کے بارے میں نہ تو میں کچھ جانتا ہوں اور نہ ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔میں تو
صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب میری انگلیاں قلم تھامتی ہیں تو میرا پورا وجود
لرزنے لگتا ہے اور ایسے میں جو کچھ خود کلامی کی صورت میں برآمد ہوتا
ہے اسے لکھ لیتا ہوں۔اگر آپ کو میری شاعری میں کوئی بے کیفیت چیز
نظر آئے تو اس کا میری شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔کوئی دیکھ نہ لے کی
اشاعت میں تاخیر کا ایک سبب تو میری بے دلی تھی اور جب اس کیفیت
سے نکل کر ۲۰۱۲ میں کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا تو پبلشر حضرات
نے شاعری کی بے توقیری کا ایسا نقشہ کھینچا کہ ایک لمحے کے لیے شاعری

کارِ زیاں محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ اگر زندگی کے تیس پینتیس سال شاعری کے بجائے شاعری کا لبادہ اوڑھ کر کسی سرکاری ثقافتی ادارے میں افسری کرتا یا کسی رشوت خور کرپٹ سسٹم کا حصہ بن کر مال کما لیتا یا مسخروں کی طرح اچھل کود کر کے اپنی شاعری کی سوچی سمجھی مارکیٹنگ کرتا تو یہی پبلشرز نہ صرف مجھے زندگی میں ہاتھوں ہاتھ لیتے بلکہ میرے مرنے کے بعد بھی بہ سروچشم میری کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع کرتے۔ امریکا میں مقیم شاعر میرے بڑے بھائی اور مشفق دوست فرحت شہزاد کے حکم کے مطابق میں نے اپنا مسودہ مارچ ۲۰۱۲ میں الحمد پبلی کیشن کے صفدر صاحب کو بھجوا دیا تھا اور انہوں نے کتاب شائع کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا مگر ایک آدھ بار فون پر بات ہونے کے بعد ان کا فون بند ہو گیا جس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ بری شاعری کی اشاعت کا معاملہ ہو تو پبلشرز کے دل و دماغ کی طرح ان کے فون بھی بند ہو جاتے ہیں۔ ایک روز خورشید عالم خورشید نے یہ خوش خبری سنائی کہ کراچی کے فرید پبلشرز کے فرید صاحب میری کتاب شائع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ان سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے یہ شرط رکھی کہ میں ان کے کسی کلائنٹ کے لیے ناول کے مسودے کی تصحیح کر دوں تو وہ میری کتاب مفت شائع کر دیں گے۔ میں فرید صاحب کی یہ پیشکش قبول نہ کر پایا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ انہوں نے میری معذرت کے

بعد اپنی شائستگی برقرار رکھتے ہوئے مجھ سے یہ ضرور پوچھ لیا کہ 'جاوید بھائی میرے لائق کوئی خدمت'۔شاعری نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا کے کونے کونے میں ہمیشہ سے مقبول رہی ہے۔شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا فورم ہو جہاں مذہبی اسکالرز سے لے کر سماجی، سیاسی رہنماؤں تک اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے شاعری کا سہارا نہ لیتے ہوں۔کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات ہوں کہ خوانچہ لگانے والے، سب ہی شاعری سے آشنا ہیں اور اپنے جذبات کے اظہار کے لئے لفظ جوڑنے کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ بسوں ،ٹرکوں ،رکشوں، تعلیمی اداروں اور شہر کی دیواروں پر بھی ہمیں جا بجا عوامی شاعری کے نمونے نظر آتے ہیں مگر شاعری کی یہ مقبولیت اور قبولیت اگر کسی کو نظر نہیں آتی تو صرف ادب کی خدمت کا دعوٰی کرنے والے پبلشرز حضرات کو۔میں نے اپنی پیشہ ورانہ حیثیت کو کبھی اپنی شاعری کے فروغ کے لئے استعمال نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو شائد آج ملک اور بیرونِ ملک ہر مشاعرے کا لازمی حصہ بن جاتا۔ مجھے اطمینان ہے کہ میرے چاہنے والے مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں اور ساری دنیا میں موجود ہیں ۔اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ ہوتی اگر قیصر منور جیسا طرح دار دوست اور شاعر مجھے بے دلی کے دلدل سے نہ نکال لے جاتا۔قیصر نے مسودے کی ترتیب میں جس محبت کا مظاہرہ کیا، اس کا احسان اُتارا

نہیں جا سکتا۔قیصر ہی کے ناتے ایک اور نوجوان دوست عرفان شایان
نے بھی صرف دو دن میں کتاب کی تزئین و آرائش کر کے مجھے خرید لیا
ہے۔نئی نسل کے نمائندہ شاعر اور میرے ساتھی خالد معین نے جس
انہماک اور لگن سے میرے مسودے کو پڑھ کر میری شاعری پر رائے
دی۔اس کے لئے میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔پہلی کتاب کی اشاعت
بھی میرے دوستوں منصور عابدی، آغا مقصود عباس، فیاض حیدر، بشیر
شاہ، ودود بٹ، موحد سلطان اور عارف ملک نے ممکن بنائی تھی اور
دوسری کتاب کی اشاعت کا سہرا بھی میرے دوستوں ہی کے سر جاتا
ہے۔اس بار میرے جگری یار سہیل احمد اور سہیل ہی کے حوالے سے
اخلاق عباسی، عمران، اعجاز ہمایوں اور ندیم جیسے چاہنے والے بھی شریکِ
سفر رہے۔کرن، موحد سلطان، نسیم اعجاز بزمی، صابر بھائی، مبین، فیاض
وید، فرحان، فرید انور جدی، ہزقیل کادوانی، عاصم رمزی، ہدایت سائر
فہیم، الیاس شاکر، زیڈ ایچ خرم، شاہد شاہ، اشرف خان، فرید خان،
شہزاد رضا، سید منظر حسین، پارو، ناصر صدیقی، شاہد صدیقی، امریکا میں
مقیم جاوید رفعت صدیقی، تعبیر آغائی کے علاوہ ہندوستان سے روزنامہ
'انقلاب' کے چیف ایڈیٹر جناب شکیل شمسی اور سہارا ٹی وی نیٹ ورک
کے سربراہ جناب حسن کاظمی، اسد ہارون اور الیاس کریم کی دعائیں بھی
شاملِ حال رہیں۔الیاس کریم کے بارے میں کیا کہوں ۔یہ میرا وہ

دوست ہے جس نے میری محبت میں اپنی سوچ کے تمام دھارے میری
ذات تک محدود کردیئے ہیں ۔الیاس کی بے پناہ محبت کا ثبوت وہ
مضمون ہے جسے آپ آئندہ صفحات پر ملاحظہ کریں گے۔الیاس
باقاعدہ ادیب ہے نہ شاعر، مگر اس کے اندر ایک ایسی کیفیت ہے جس
کے اظہار نے اسے صفِ اول کے ادیبوں میں لا کھڑا کیا ہے۔میرے
مشفق دوست اور بڑے بھائی طلعت حسین کی نیک تمنائیں بھی
میرے لئے کسی سرمائے سے کم نہیں ۔خدا انہیں جلد صحت یاب
کرے۔میں محترمہ ثمینہ اشفاق کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں
نے فیس بک پر شائع ہونے والی میری دو نظموں کو رنگوں کی زبان دی۔
خدا کا شکر ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر آرٹس کونسل سمیت کسی ثقافتی
ادارے کا کوئی احسان ہے اور نہ ہی کسی سکہ بند نقاد کا۔میری خواہش
ہے کہ جب آپ الیاس کریم ، خالد معین اور قیصر منور کے مضامین سے
گزر کر میری شاعری کی طرف جائیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں
۔میں آپ کی نگاہوں سے اپنا تماشہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

جاوید صبا

۲۲ جون کراچی

میری جان صبآ

میں اپنے اس دوست کی ولادت کے بارے میں تو کچھ زیادہ نہیں جانتا کہ یہ کب، کہاں اور کیوں ہوئی۔ مگر اِتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ جب جہاں اور جس لئے بھی ہوئی، خوب ہوئی۔ میرے لیے تو صبآ کی پیدائش اُس لمحے ہوئی جب جون ۸۵ء کی ایک گرم ترین دوپہر میں بلوچستان یونیورسٹی کے کمرۂ امتحان میں پرچہ حل کرتے ہوئے، اُسے سگریٹ کی طلب نے اِس قدر ستایا کہ وہ اپنا پرچہ ادھورا چھوڑ کر کمرۂ امتحان سے باہر نکلا۔ اور مجھ اجنبی شخص کی اُنگلیوں میں سلگتے سگریٹ کو بغیر اِجازت اپنی انگلیوں میں منتقل کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا: یار وقت کیا ہوا ہے؟۔ میں نے تو اُسی لمحے دل ہی دل میں کہہ ڈالا۔ دوستی کا وقت ہو چلا ہے۔ مگر زبان سے نکلا۔ پونے بارہ۔ اُس نے سلگتے سگریٹ کو جو

قریب قریب اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا، اپنے جوتے تلے اُس کی آخری رسومات ادا کرتے ہوئے کہا' یار وقت بہت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ میں ابھی آیا۔ جانا مت۔' اس طرح وہ اجنبی میرے گرد اپنی بے تکلف باتوں کا حصار کھینچ کر کمرہ ٔامتحان میں اپنے ادھورے پرچے کی تکمیل کے لیے واپس چلا گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اُس کا مسکراتا چہرہ دوبارہ میرے سامنے موجود تھا۔ اُس لمحے اسکی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایک ایسی چمک جسے بیان کرنا بھی چاہوں تو نہ کر پاؤں۔ 'چلو بھئی جان چھوٹی۔۔ آج میرا پریوئیس کا آخری پرچہ تھا۔۔ پریکٹیکل میں ابھی کافی دن باقی ہیں۔۔ ابھی آپ کا بھائی شیو بنائے گا، نہا دھوکر فریش ہوگا اور پھر آپ کے ساتھ چائے پی جائے گی۔' وہ یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہتے ہوئے مجھے اپنے ہاسٹل کے کمرے میں لے گیا ۔ وہاں اُس نے جنات کی سی تیزی سے وہ سب کچھ کر ڈالا، جس کے بعد چائے پی جانی تھی۔ 'میری جان زندگی تیز چلنے کا نام ہے۔ چلیئے اُٹھیئے کہیں چل کر چائے پیتے ہیں'۔ اور چند ہی لمحوں بعد ہم دونوں یونیورسٹی کی کینٹین میں ایک ہی میز پہ آمنے سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ 'میرا نام جاوید صبا ؔ ہے۔ لیکن تم مجھے صبا ؔ کہہ سکتے ہو'۔ الیاس کریم، میں نے اپنا تعارف کروایا۔ اِس دوران خالی کپ اٹھاتے ہوئے ویٹر نے کہا، 'صاحب، پیسے' صبا ؔ نے اِس یقین کے ساتھ اپنی خالی جیب میں

ہاتھ ڈالا جیسے سچ مچ بصورتِ رقم کچھ نہ کچھ ضرور نکل آئے گا۔مگر یہ اُس کی خام خیالی تھی۔مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔'یار کمال ہے۔آج کل لوگ چائے کے بھی پیسے مانگتے ہیں'۔ویٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔'صاحب کیا کریں مجبوری ہے''۔میں نے فوراً حالات کو بھانپتے ہوئے کہا۔جاؤ میرے حساب میں لکھ لو۔'اچھا صاحب۔ویسے آپ کا حساب بھی تو کتاب کی شکل اختیار کر چکا ہے'۔یہ کہہ کر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔اور اس طرح اُدھار کی چائے پلا کر میں نے اپنے اس نومولو دوست کے کان میں دھیرے سے دوستی کی اذان دے دی اور پھر اِس دوستی کو نظر بد سے بچانے کے لئے ہم دونوں دیر تلک وہیں بیٹھے اِسے سگریٹوں کی دھونی دیتے رہے۔ہماری اِس دوستی کی بنیاد میں ذ ہنی مطابقت کے ساتھ ساتھ جو قدر سب سے زیادہ نمایاں اور مشترک پائی جاتی تھی وہ ہماری جیبوں کا بانجھ پن تھا۔کبھی کبھار تو اپنی قمیض پر لگی ہوئی جیب کو دیکھ کر درزی کی کم علمی پہ ہنسنے کو جی چاہتا۔اور مزے کی بات یہ ہے کہ اُن دنوں ہم نہ جانے کیسے ان حالات کو اِنجوائے بھی کرتے۔صبؔا کی شاعری کی طرح اُس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔اور خاص طور پہ خالی پیٹ تو بہت ہی'' بیس'' میں بولا کرتا اور اِسی لئے وہ اکثر ہی بیس میں بولتا تھا۔ایک دن جب میں یونیورسٹی پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔'چلو یار واپس بازار چلتے ہیں۔آج کوئی پیریڈ

نہیں لیا جائے گا' میں نے خیریت طلب کی تو فرمایا۔' آج آپ کا بھائی دنیا کا امیر ترین شخص ہے'۔کیا کسی کروڑ پتی باپ کی اکلوتی بیٹی کو آپ سے عشق ہو گیا ہے۔؟ میں نے دریافت کیا۔'نہیں یار'اور یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک سو چالیس ، ایک سو چالیس روپوں کے دو عدد چیک ہوا میں لہرائے۔'' یہ دیکھو۔گزشتہ دنوں آپ کے بھائی نے ریڈیو پاکستان میں دو انٹرویوز کیے تھے۔ یہ اُس کا معاوضہ ہے للو''۔اِن چیکس کو دیکھ کر خیال آیا چلو چند دن اَچھے گزر جائیں گے۔جب ہم متعلقہ بینک پہنچے تو وہاں ہمیں یہ خبر ملی کہ اِن چیکس کو کیش کروانے کے لئے اِن کی پشت پہ چالیس، چالیس پیسے کے رسیدی ٹکٹوں کا چسپاں ہونا لازمی ہے ۔بس یوں سمجھئے کہ اِس خبر سے ہم کھجور میں اَٹک کر رہ گئے۔۔میں نے کھنکھیوں سے صبا کو دیکھا تو اُس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔'اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں'۔اُس لمحے اُس کی آواز میں بلا کا 'بیس' تھا۔جس سے مجھے اُس کی بھوک کی شدت کا اندازہ ہو گیا۔بس یوں سمجھئے کہ اُس لمحے میرے اِس دوست کے 'دنیا کا امیر ترین شخص' بننے کے راستے میں چالیس چالیس پیسے کے دو عدد رسیدی ٹکٹ بری طرح حائل تھے اور ایسے میں اِن ۸۰ پیسوں کا ملنا محال ۔ہم چیکس واپس لے کر دبے پاؤں بینک سے باہر نکلے۔اُس لمحے مجھے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے یہ چیکس صبا کو گھور گھور کر

دیکھتے ہوئے کہہ رہے ہوں۔ابے للو۔خیر چھوڑیئے ۔
قدرت بھی اِنسان کے ساتھ کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے ۔بعض اوقات
اِنسان کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں ہوتا۔وہ لبِ جو بھی
پیاسا ہی بیٹھا رہتا ہے ۔ صبآ ' نے اِن چیکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔
'یار حالات نے شاید اِس کرنسی کو ہمارے لئے منسوخ کر دیا ہے'۔
اَچانک اُسی لمحے میری نظر ایک شناسا پر پڑی۔ جسے میں نے آواز دے
کر روک لیا۔ یار طاہر۔ ایک روپیہ کھلا ہوگا تمہارے پاس۔؟۔اُس
نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔''یہ تمہیں چونیوں کی کیا ضرورت پیش آ گئی
''؟۔یار تم سمجھے نہیں۔مجھے ایک روپیہ اُدھار چاہیے۔میں نے
وضاحت کر دی ۔'اس نے مجھے روپیہ دیتے ہوئے کہا۔'شاعروں کے
ساتھ رہو گے تو ایسا ہی ہوگا'۔طاہر کے اِس جملے کی کاٹ کو خوشی کے اِس
تصور نے بالکل بے اثر کر کے رکھ دیا کہ اَب میرے اِس دوست کو'' دنیا
کا اَمیر ترین شخص'' بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔۔۔دونوں چیکس کیش
کروائے گئے ۔ایک سو چالیس جمع ایک سو چالیس۔ پورے دو سو اسی
روپے۔صبآ نے یہ رقم پانچ پانچ روپوں کے نوٹوں کی صورت میں وصول
کی ۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے ۔کہ نہ تو اِن نوٹوں کو شمار کیا گیا اور
نہ ہی اِنہیں کسی ترتیب یا سلیقے سے تہہ کر کے جیب میں رکھا گیا۔ بلکہ وہ
ان نوٹوں کو مٹھیاں بھر بھر کے پینٹ کی جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔اور اَب

جونہی ہم نے بینک سے باہر پہلا قدم رکھا صباؔ کے سامنے ایک بھکارن کا دستِ سوال بلند ہوا۔ صباؔ نے انتہائی تیزی سے ایک مٹھی نوٹ اپنی جیب سے نکال کر اِس بھکارن کے ہاتھ پہ دھر دیئے۔ وہ حیرت سے صباؔ کا چہرہ تکنے لگی۔ مگر میرا یہ دوست اِس کی حیرت سے بے نیاز آگے بڑھ گیا اور اُسی لمحے اِس بھکارن نے قریب ہی موجود اپنی دوسری ساتھی بھکارن کو صباؔ کی سخاوت کی مخبری کر دی۔ اُس کے دستِ سوال سے بھی ویسا ہی برتاؤ کیا گیا۔ اُس لمحے مجھے بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے واقعی میرا یہ دوست دنیا کا امیر ترین شخص ہے۔ خوشی اِس کے چہرے پہ رقص کر رہی تھی۔ یہ اندازہ لگانا خاصہ مشکل تھا اس وقت صباؔ کی جیب کی بقیہ صورت حال کیا تھی۔؟ سخاوت کے اِن مراحل سے گزرنے کے بعد اب خیال آیا۔ 'مسئلہ بھوک کا ہے، پیٹ کدھر جائے گا'۔ تو جناب اَب اِس پیٹ کی خاطر مدارت کے لئے ہم ایک ہوٹل پہنچے۔ اور کڑاھی گوشت کھا کر بلکہ کھلا کر اِس پیٹ کو بھی بھکارن کی طرح حیرت میں ڈال دیا۔ حلق سے چند ہی لقمے اُترنے کے بعد پیٹ میں سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔ بالکل یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارا نظامِ انہضام اِس اجنبی خوراک کو پہچاننے کے لئے کسوٹی کا کھیل کھیل رہا ہو۔ جب اِس مرغن غذا کا مبلغ ۹۰ روپے بل چکانے کی باری آئی تو صباؔ نے بے ترتیب نوٹوں کی صورت میں جیب سے نکلنے والے کل سرمائے کو کاؤنٹر پہ ڈھیر کر دیا۔ کاونٹر پہ

موجود بے چارہ ہوٹل کا مالک ایک ایک نوٹ کی سلوٹیں دور کرنے کے لئے اِنہیں اپنی ہتھیلی کی مدد سے اِستری کرنے میں مصروف ہوگیا تا کہ کسی طور انہیں شمار کرنا ممکن ہو۔ اور جب شمار کیا گیا تو یہ کل ۸۰ روپے ہوئے۔ صبا نے حسبِ معمول پھر سے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ہاتھوں کو اِس انداز سے باہر کی جانب کھینچا کہ پینٹ کی دونوں جیبیں بکری کے کانوں کی طرح باہر کو لٹکنے لگیں جسے دیکھ کر ہوٹل کے مالک نے مسکراتے ہوئے کہا۔ 'کوئی بات نہیں صاحب۔ دس روپے بعد میں دے دیجئے گا'۔ 'تھینک یوٗ۔ صبا نے کہا۔ مگر اب کی بار تھینک یو کہتے ہوئے اُس کی آواز کا 'بیس' بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اُن دنوں صبا اور میں نے اِن فاقہ مستیوں کو خوب اِنجوائے کیا۔ وہ زندگی گزارنے کے ہنر سے خوب واقف تھا۔ وہ نالہءخوابِ اَمروز کی سکیاں سننے کا ہرگز عادی نہ تھا بلکہ اُس کی نظر تو ہمیشہ اپنے آنے والے کل پہ مرکوز رہتی۔ لیکن یہ بات میرے لئے ہمیشہ تعجب کا باعث رہی کہ لفظوں کی دنیا سے کھیلنے والا یہ شخص پتھروں کی دنیا سے کیوں اُلجھ رہا تھا۔؟۔ اسے جیالوجی سے کیا لینا دینا۔؟۔ صبا نے مذکورہ مضمون میں ماسٹرز کیا اور واپس روشنیوں کے شہر جا بسا جہاں مختلف اخبارات اور رسائل سے ہوتے ہوئے آج کل ٹیلی وژن کے ایک چینل پہ اپنی خدمات سر انجام دے رہا ہے۔ کبھی کبھار جب اسے ٹیلی وژن پہ دیکھتا ہوں تو بہت

اچھا لگتا ہے مگر اب اِس کی آواز میں وہ 'بیس' نہیں رہا۔کراچی اِنسانوں کا اِک سمندر ہے۔ جہاں ہر شخص اِک دوسرے سے بے خبر روبوٹ کی مانند اپنے اپنے کام میں جتا رہتا ہے ۔ میرا یہ دوست بھی کراچی کی اِس مشینی دنیا کا ایک ایسا کل پرزہ بن کے رہ گیا ہے جو باقی مشینوں کو فعال رکھنے کے لئے شب و روز اپنے دیگر متعلقہ پرُزوں سے دست و گریباں رہتا ہے۔میرا یہ دوست نہ صرف کراچی کے دل میں دھڑکتا ہے بلکہ کچھ آنکھوں میں کھٹکتا بھی ہے۔اللہ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔آمین۔کبھی کبھارفون پہ بات ہوجاتی ہے۔مگر وہ کبھی فون نہیں کرتا۔اگر غلطی سے میں کبھی اس خواہش کا اظہار کر بھی دوں تو وہ میری اس خواہش کے احترام میں صرف اتنا کہتا ہے 'میری جان ۔زندگی بہت فاسٹ چل رہی ہے۔کیا کروں۔وقت ہی نہیں ملتا۔سمجھا کرؤاور میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ جا تا ہوں۔

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور ویسے بھی اس نے اپنے ہی ایک مصرعے میں اپنے اس رویے کا اعتراف بھی تو کرر کھا ہے۔

تم کسی کے نہ ہوئے اور تمہارے ہوئے لوگ'

الیاس کریم

کوئٹہ

دشتِ حیراں کا مسافر

جاوید صبا ایک ایسے باکمال، تخلیقی وفور سے مالا مال اور جمالیاتی بہاؤ سے لبریز منفرد شاعر ہیں، جن کے دوسرے مجموعے کا ادبی حلقوں میں بڑی شدّت کے ساتھ انتظار کیا گیا۔ 'عالم مرے دل کا' میں جاوید صبا نے جن تخلیقی فتوحات کا آغاز کیا تھا، اپنے دوسرے مجموعے 'کوئی دیکھ نہ لے' میں انہوں نے یقینا جدید شعر و ادب کے نئے معیارات سے ہم رنگ و ہم آمیز غزلیں اور نظمیں پیش کی ہیں۔ ان کا نیا مجموعہ، جہاں ایک طرف جدید غزل کی نئی زبان، نئے محاورے، نئے اسلوب، نئے ڈکشن اور نئی طرزِ ادا کو اپنی گرفت میں لاتا ہے، وہاں اس غزل میں روایت کے گہرے شعور اور جدید حسّیت کے تال میل کے ساتھ، وہ خاص رنگ ڈھنگ، جذباتی اور جمالیاتی لہر، نئی زمینوں کی چمک، نئے

آدمی کی دانش، اَنا، وقار اور اُس کی تنہائی، اُس کا عشق، اُس کے ہجر و وصال، اس کے لحہ لحہ بدلتے ہوئے عذاب و ثواب۔ اس کے علاوہ اس غزل میں جدید عہد کی نئی اور پُر پیچ نفسیات کے اثرات، بدلتی ہوئی معاشرتی اقدار کے بکھراؤ، سیاستوں کے ملکی اور عالمی داؤ پیچ، تہذیبی اور ثقافتی شکست و ریخت کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ منفرد اور جان دار غزلوں کے ساتھ ساتھ نئے شعری مجموعے میں جاوید صبا کی ایسی متعدد شان دار، طویل اور مختصر تاثراتی اور فکری نظمیں بھی موجود ہیں، جن کے موضوعات، جن کا ٹریٹمنٹ، جن کا اسلوب اور تند و تیز تخلیقی بہاؤ قابل ِ دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ ان نظموں میں صبا صاحب کے ذاتی شب و روز، دُکھ سکھ، ایک عشقِ بلا خیز کی گہری پرچھائیاں، باشعور آدمی کے ٹوٹتے بنتے خواب و خیال کا عکس بھی ہے اور ساتھ ساتھ صبا صاحب کی ہمہ وقتی اضطرابی اور تخلیقی شخصیت کا بھرپور رچاؤ بھی حسن کاری کے ساتھ موجود ہے، صبا صاحب نے ان نظموں میں بعض ملکی اور عالمی سطح کے سنجیدہ اور بڑے مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ جاوید صبا نے اس بار چند تراجم بھی نئے مجموعے میں شامل کیے ہیں، جن میں شیکسپئر اور بودلیئر کی نظمیں بہ طورِ خاص بڑی بے مثال ہیں، اور ترجمے سے زیادہ تخلیق کا احساس دلاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو میرے پیش رو اور پسندیدہ ترین شاعر، جاوید صبا نے بیس پچیس برس کی طویل تخلیقی

ریاضت کے بعد ’کوئی دیکھ نہ لے‘ میں اپنی گہری انفرادیت، تکمیلیت اور اعتباریت کی کچھ ایسی منزلیں سَر کر لی ہیں، جس کے بعد کم سے کم مجھے تو ان کے ہمعصروں میں اب ان کی ٹکر کا ایک بھی لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ یہ وہ منصبِ خاص ہے، جس تک پہنچنے کی خواہش تو سب کرتے ہیں، تاہم اس تک رسائی عہد کے چند گنے چُنے شعرا ہی کے حصے میں آتی ہے۔

خالد معین

اپنے مطلب کا شاعر

جاوید صبا سے میری پہلی ملاقات کراچی آرٹس کونسل کے نوٹس بورڈ کے ذریعے ہوئی۔ جہاں ایک مشاعرے کے دعوت نامے پر بمعہ تصویر جاوید صبا کا یہ شعر موجود تھا۔

اُس نے آنچل سے نکالی مری گم گشتہ بیاض
اور چپکے سے محبت کا وَرَق موڑ دیا

اس شعر کو پڑھ کر بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسا ’جاوید صبا‘ کو اپنی گم شدہ محبت کے ملنے پر ہوا ہوگا۔ شعر اچھا لگا اور حافظے کا حصہ بھی بن گیا۔ ابھی

کچھ ہی دن گزرے تھے اور میں اس شعر کی گونج سے نکل بھی نہیں پایا تھا۔ کہ جاوید صبا کے مجموعہء کلام 'عالم مرے دل کا' پڑھنے کا موقع ملا۔ پہلا شعر پڑھتے ہی سرشاری کا احساس ہوا اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ 'اپنے مطلب کا شاعر ہے'۔۔وہ شعر کیا تھا۔آپ بھی سنئے۔

کج کُلاہی کا سبب یہ ہے کہ گھر لوٹ کے ہم
اُس کے قدموں میں جھکادیتے ہیں پیشانی کو

اس شعر کو پڑھتے ہی مجھے اُس زمانے کا ایک مشہور گیت 'ترچھی ٹوپی والے' یاد آگیا۔اردو شاعری میں جہاں بھی کج کلاہ کا ذکر آتا ہے۔بانکے، سجیلے، کسی حد تک آوارہ مزاج اور دل پھینک نوجوان کی خیالی تصویر ذہن میں اُبھرتی ہے۔لیکن جاوید صبا نے 'کج کلاہی' کو جس نئے زاویے سے دیکھا اور لکھا، ایسے پہلی دفعہ دیکھا اور لکھا گیا۔اس شعر کو میں روایت اور جدیدیت کا حسین ترین امتزاج سمجھتا ہوں۔اس شعر کے بعد میں آگے بڑھا تو بارہا ایسے مقامات آئے جہاں مجھے رُکنا پڑا کیوں کہ کسی بھی 'سمجھدار اور حساس قاری' کو اتنے اچھے اشعار ایک ہی وقت میں نہیں پڑھنا چاہیے۔اس میں ایک تو اچھے شعر کا لطف چلا جاتا ہے اور دوسرا خرابیِ صحت کا بھی خدشہ رہتا ہے۔خیر۔'عالم مرے دل کا' پڑھنے کے دوران کئی بار یہ احساس ہوا جیسے یہ میرے ہی

دل کا عالم ہو۔اوراس بات پر ایک شام تصدیق کی مہر ثبت ہوگئی ۔جب میں عالمِ وحشت میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ گلی کے بیچ و بیچ کھڑا با آوازِ بلند جاوید صبؔا کے اشعار دُہراتا ہی چلا گیا۔

شکستگی نے مرا حوصلہ بحال کیا
جواب دے گئی ہمت، تو پھر سوال کیا

سوال یہ ہے کہ جب زخم ہی نہیں بھرتے
تو پھر کسی نے یہاں کون سا کمال کیا

آواز کی بلندی اور اپنی کیفیت کا اندازہ اُس وقت ہوا۔ جب گلی کے کچھ شرارتی بچے 'شکستگی، شکستگی' کی صدائیں بلند کرنے لگے۔اور میں نے شرمسار ہوکر راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔ کچھ دنوں بعد جاوید صبا سے سرسری ملاقات بھی ہوئی۔لیکن مجلسی ملاقاتوں کا یہ سلسلہ رسمی ہی رہا۔ کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ایک دن جاوید صبا میرے ہی دفتر میں،سگریٹ نوشی کرتے ہوئے پائے گئے۔۔کئی مہینوں تک اسموکنگ ایریا میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔آہستہ آہستہ دُھند چھٹتی رہی،غزلیں سنائی گئیں،شاعری پر گفتگو ہوئی۔ہم دونوں کا دفتر بھی ایک۔اور گھر بھی

قریب۔بس پھر کیا تھا۔دن بھر دفتر اور رات گئے ہوٹل پر غزلوں اور نظموں کے ساتھ چائے بھی پی جانے لگی۔اور الوداعی رسم کے طور پر بغیر چھالیہ کے پان چبائے جانے لگے۔ان ملاقاتوں کے دوران میں نے جاوید صبآ سے کم وبیش تمام ہی غزلیں اور نظمیں سنی ہیں۔جو ان کے تازہ مجموعۂ کلام 'کوئی دیکھ نہ لے' میں شامل ہیں۔جاوید صبآ کے ہاں جو تغزل اور تہہ داری میں نے دیکھی ہے وہ مجھے فی زمانہ شاذ و نادر ہی کسی شاعر کے کلام میں دکھائی دیتی ہے۔آپ میری اس رائے سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں اور اختلاف بھی۔لیکن میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا ہے کہ اگر شاعری انسان کی فطری کیفیات سے جڑی ہوئی ہے تو وہ دیر پا ہوتی ہے اور تروتازہ بھی رہتی ہے کیوں کہ انسان کی فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔خوشی، دکھ، خواب، خواہش، موسم، آنسو، درد، محبت، نفرت، رقابت، یہ وہ کیفیات ہیں۔جو انسان کی فطرت سے جڑی ہوئی ہیں۔موضوعات، نظریات، سیاست اور حالات تبدیل ہوجاتے ہیں۔لیکن انسان کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔جاوید صبا کی شاعری میں بھی آپ کو اسی طرح ایک جیتا جاگتا انسان نظر آئے گا۔جو محبت بھی کرتا ہے، جسے دکھ بھی ہوتا ہے، جو وصل کی آرزو بھی کرتا ہے، جسے خواب بھی آتے ہیں، جس کے دل میں خواہشات بھی ہیں، جو مسکراتا ہے اور آنسو بھی بہاتا ہے۔جاوید صبا کی شاعری میں یہی وہ

خاصیت ہے کہ جب قاری پڑھتا ہے۔تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شعر اسی کے لئے ہی لکھا گیا ہو۔اور جب یہ احساس ہونے لگے تو سمجھ لیجئے کہ یہ شعر رہنے والا ہے۔اس مجموعۂ کلام کا ایک بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔۔لیکن ان نظموں کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک حصہ وہ جس میں جاوید صبا نے عوامی،نظریاتی اور سماجی موضوعات کو قلم بند کیا ہے۔جن میں سماج میں ہونے والی مثبت تبدیلیوں اور اقدار کو بلاامتیازِ رنگ ونسل سراہا بھی ہے۔اور سماجی توڑ پھوڑ اور عالمی سیاست کے بازار میں کالا دھندا کرنے والوں کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا ہے۔نظم کا دوسرا حصہ نہایت باریک بینی سے مطالعہ کا متقاضی ہے۔ان نظموں میں جاوید صبا کے اندر کا تجسس، حیرت، تخیل اور تشکیک نظر آتی ہے۔بیشتر نظمیں موجود سے پرے لے جاتی ہے۔اور ایک نئے جہانِ معنی سے روشناس کرواتی ہیں۔انسان کے وجود اور کائنات سے پرے کسی کائنات کا تصور، گہری کھائی، ماورائی داستانیں اور دیومالائی کردار۔یہ ایک ایسا جہان ہے جس میں انسان اپنے اصل اور اپنے وجود کی پہچان حاصل کرنے کے لئے داخل ہوتا ہے۔اور پھر اس میں گم ہوتا ہی چلا جاتا ہے۔سراغِ زندگی، بچت بازار، دیارِ بے وجود وغیر آشنا، ہجر آشوب، وجودِ نامعلوم، دوئی کا نغمۂ الست اور ایسی ہی کئی نظمیں خلوت سے آگے کہیں دور، خوابوں کی تنہائی

میں کسی اور بستیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ جہاں ایسے دیو مالائی کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے جن کا ذکر صرف داستانوں میں ملتا ہے۔ نجانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جاوید صبا بھی شاید کسی ایسی ہی داستان کا کوئی کردار ہے۔ جو شاید ٹائم مشین کے ذریعے اس عہد کے دکھ اور لذتیں سمیٹنے چلا آیا ہے۔ لیکن شاید اسے اس بات کا اندازہ نہیں ہے۔ کہ وہ سمیٹنے سے زیادہ دینے والا ہے۔

قیصر منور

علیہ السلام

پیوستہ ہو کے خاک سے اُبھری کرن تمام
آتش کدے میں راکھ ہوئے اہرَمن تمام

خلوت گہہِ خیال سے نکلی بصد نیاز
وہ گفتگو کہ جس پہ ہوئے ہیں سخن تمام

بس اک نگاہِ ناز کے اُٹھنے کی دیر تھی
قدموں میں آ کے بیٹھ گئی انجمن تمام

قدرت سے کیا بعید، مگر ایک نقشِ حسن
ایسا بنا دیا کہ ہوا سارا فن تمام

کیا خار و گل، نسیم و صبا، کیا خزاں بہار
اُن سے ہے فیض یاب، چمن کا چمن تمام

اللہ کی طرف سے ہے حرف و کلام و صوت
منجانب خدا ہے سخن کا سخن تمام

علیہ السلام

بڑی مشکل سے چھپایا ہے، کوئی دیکھ نہ لے
آنکھ میں اشک جو آیا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

یہ جو محفل میں مرے نام سے موجود ہوں میں
میں نہیں ہوں، مرا دھوکا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

سات پردوں میں چھُپا کر اُسے رکھا ہے مگر
دل کو اب بھی یہی دھڑکا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

ڈر رہا ہوں کہ سرِ شام تری آنکھوں میں
میں نے جو وقت گزارا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

ہاتھ نرمی سے چھڑاتی ہوئی خلوت نے کہا
یہ جو خلوت ہے، تماشا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

تیرا میرا کوئی رشتہ تو نہیں ہے لیکن
میں نے جو خواب میں دیکھا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

ساتھ چلنا ہے، تو غیروں کی طرح ساتھ نہ چل
شہر کا شہر شناسا ہے، کوئی دیکھ نہ لے

ایک شعر

عشق کو یہ کمال حاصل ہے
وقت بے وقت اچھا لگتا ہے

السلام علیہ

تجھ کو پانے کی یہ حسرت مجھے لے ڈوبے گی
لگ رہا ہے کہ محبت مجھے لے ڈوبے گی

حالتِ عشق میں ہوں اور یہ حالت ہے کہ اب
ایک لمحے کی بھی فرصت مجھے لے ڈوبے گی

اب میں سمجھا ہوں کہ یہ دردِ محبت کیا ہے
یہ ترے پیار کی شدّت مجھے لے ڈوبے گی

میری بیتابیء دل چین نہ لینے دے گی
تیری خاموش طبیعت مجھے لے ڈوبے گی

تیری آنکھوں کے سمندر میں خیالوں کی طرح
ڈوب جانے کی یہ عادت مجھے لے ڈوبے گی

ڈوبتی نبض کہیں کا نہیں چھوڑے گی مجھے
درد لے ڈوبے گا، وحشت مجھے لے ڈوبے گی

تیری آنکھوں کا یہ جادو کہیں لے جائے گا
یہ تری سادہ سی صورت مجھے لے ڈوبے گی

تیرے اشکوں سے کلیجہ مرا کٹ جائے گا
میری حسّاس طبیعت مجھے لے ڈوبے گی

ہر قدم پر میں ترا بوجھ اُٹھاؤں کیسے
زندگی تیری ضرورت مجھے لے ڈوبے گی

علیہ السلام

ہم بھی مجھ سے نہیں ہے گریز پا بھی نہیں
وہ اجنبی جو ابھی مجھ سے آشنا بھی نہیں

بچھڑ گیا، تو بتائے گا کون تیرا پتا
ترے سوا تو کسی کو میں جانتا بھی نہیں

وہ رہ گزر، وہ در و بام ہائے خواب و خیال
اٹھا کے آنکھ اُدھر اب وہ دیکھتا بھی نہیں

وہ ایک عہد، وہ پیماں جسے وہ بھول گیا
اب اُس کو یاد دلانے کا فائدہ بھی نہیں

مزاج پرسی بھی کی، میرا حال بھی پوچھا
مگر وہ ایسے ملا تھا کہ بس، ملا بھی نہیں

مٹا دیے ہیں گزشتہ نقوشِ پا دل نے
پلٹ کے جانے کا اب کوئی راستہ بھی نہیں

وہ بے وفا بھی جو ہوتا، تو صبر آجاتا
ملال ہے تو یہی ہے کہ بے وفا بھی نہیں

سُنا ہے وقت کا مرہم بڑا مسیحا ہے
مگر وہ زخمِ جدائی کہ جو بھرا بھی نہیں

یہ اک تعلقِ خاطر بھی کم نہیں ہے صباؔ
وہ مجھ سے خوش تو نہیں ہے مگر خفا بھی نہیں

رہتے تھے صبح سے جو مرے ساتھ شام تک
اب یاد بھی نہیں ہیں مجھے اُن کے نام تک

اِک رات تھی کہ صبح تلک ہم سفر رہی
اِک دن تھا جس نے ساتھ دیا میرا شام تک

اِک بھول تھی کہ یاد کے رستے میں رہ گئی
اِک یاد تھی جو ساتھ چلی دورِ جام تک

اِک چاند تھا جو بام سے ہمراہ لے گیا
اِک چاندنی کہ چھوڑ گئی مجھ کو بام تک

ٹوٹا نہ دل سے دل کے تکلم کا سلسلہ
خاموشیوں سے لے کے مری جاں کلام تک

جن سے دُعا سلام ضروری نہ تھی کبھی
اب رہ گئی ہے اُن سے دُعا و سلام تک

محدود ہو کے رہ گئی کچھ دن سے زندگی
رزقِ حلال و خواہشِ آبِ حرام تک

ایک شعر

حسرتوں کے رزق میں برکت ہوئی
خواہشوں کا آب و دانہ اُٹھ گیا

علیہ السلام

یہ سوچ سوچ کے وحشت سی ہو رہی ہے مجھے
کہ پھر کسی سے محبت سی ہو رہی ہے مجھے

گزشتہ عہد کی رُسوائیوں کا بوجھ لیے
نئی رُتوں سے ندامت سی ہو رہی ہے مجھے

جو ہو سکے تو مجھے یاد ہی نہ آیا کرو
تمھاری یاد کی عادت سی ہو رہی ہے مجھے

وہ ایک بات جو دل میں چُھپا کے رکھی ہے
میں کیا کہوں کہ قباحت سی ہو رہی ہے مجھے

یہ کیا کِیا کہ نہ رکھا لحاظِ ہم سفری
ترے سلوک پہ حیرت سی ہو رہی ہے مجھے

ترے نہ ہونے کا غم شاد باد رکھتا ہے
نشاطِ غم پہ خجالت سی ہو رہی ہے مجھے

ایک شعر

مُژدہ، کہ وصلِ یار نہ ہوگا کبھی نصیب
احسان مند ہوں خلشِ ناتمام کا

؟ السلام علیہ

مرے قریب ہو یا ناگہاں چلی گئیں تم
ابھی ابھی تو یہیں تھیں، کہاں چلی گئیں تم

مرے وجود میں اتری تھیں گنگناتے ہوئے
مرے وجود سے کیا نغمہ خواں چلی گئیں تم

خزاں کی رُت کا گلستاں سے چل چلاؤ ہُوا
کہیں سے گھومتے پھرتے جہاں چلی گئیں تم

جھلس رہا ہوں کڑی دھوپ میں جدائی کی
مثالِ سایۂ ابرِ رواں چلی گئیں تم

مرے قریب ہو، پہلو میں ہو، مگر اب بھی
نہ جانے کیوں ہے مجھے یہ گماں، چلی گئیں تم

اُٹھیں گے اور بھی طوفان بے قراری کے
چلیں گی اور ابھی آندھیاں چلی گئیں تم

کہا تھا میں نے کہ دامن نہ چھوڑنا دل کا
پسِ غبارِ رہِ کارواں چلی گئیں تم

ارے یہ تم نے کہاں رکھ دیئے ہیں خواب مرے
میں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں، کہاں چلی گئیں تم

ابھی تو قصۂ دردِ جگر کیا تھا شروع
چلی گئی ہو مری جانِ جاں، چلی گئیں تم

چلی گئی ہو، تو یہ دل اُداس اُداس سا ہے
تمہی تھیں بزم کی رُوحِ رواں چلی گئیں تم

؟ السلام علیہ

چُپ چُپ اُداس اُداس نظر آرہی ہو تم
بیٹھے بٹھائے جانے کہاں کھوگئی ہو تم

ہونٹوں پہ اک خموش تبسم کی چاپ ہے
آنکھیں بتا رہی ہیں بہت بولتی ہو تم

شاید رواروی میں کوئی بات کہہ گیا
کہنا یہ چاہتا تھا کہ اچھی لگی ہو تم

کیا تم یہ کہہ رہی تھیں کہ میں ہوں قرارِ جاں
کیا میں یہ کہہ رہا تھا مری زندگی ہو تم

اے جانِ بے فراق، کسی کے فراق میں
میں نے سُنا ہے زہر تلک کھا چکی ہو تم

محفل میں جس سے بات ہوئی تھی، وہ تم نہ تھیں
خلوت میں میری جان کوئی دُوسری ہو تم

انگڑائیوں میں، نیند میں، آنکھوں میں، خواب میں
کوئی نہیں، تمہی ہو، تمہی ہو، تمہی ہو تم

شاید تمہیں عزیز نہیں اپنی زندگی
کیا کررہی ہو، دل کی دوا کر رہی ہو تم

حیرت ہے اپنے عکس کو پہچانتی نہیں
مڑمڑ کے آئینے کی طرف دیکھتی ہو تم

علیہ السلام

آنکھ مری بھر آئی ہے
یار بڑی تنہائی ہے

دل کو کچھ مت کہنا یار
پاگل ہے، سودائی ہے

سوچ رہا ہوں اُس کی یاد
کِس سے مل کر آئی ہے

کئی دنوں کے بعد وہ زلف
آج کہیں لہرائی ہے
تُو نے خواب دکھائے تھے
تُو نے نیند اُڑائی ہے

آ کر میری آنکھوں میں
نیند بہت پچھتائی ہے

پیار کا روگ لگانا مت
پیار بڑا ہرجائی ہے

ایک شعر

پڑ چکی ہوگی اسے عادت مری
اب مجھے کچھ اور کرنا چاہیے

علیہ السلام

لہراتا ہے خواب سا آنچل اور میں لکھتا جاتا ہوں
پلکیں نیند سے بوجھل بوجھل اور میں لکھتا جاتا ہوں

جیسے میرے کان میں کوئی چپکے چپکے کہتا ہے
عشق جنوں ہے، عشق ہے پاگل، اور میں لکھتا جاتا ہوں

چھوٹی چھوٹی بات پہ اُس کی آنکھیں بھر بھر آتی ہیں
پھیلتا رہتا ہے پھر کاجل اور میں لکھتا جاتا ہوں

آنکھ میں اُس کے عکس کی آہٹ دستک دیتی رہتی ہے
بھر جاتی ہے اشک سے چھاگل، اور میں لکھتا جاتا ہوں

مدھم مدھم سانس کی خوشبو ، میٹھے میٹھے درد کی آنچ
رہ رہ کے کرتی ہے بے کل، اور میں لکھتا جاتا ہوں

دھیمے سروں میں درد کا پنچھی اپنی دُھن میں گاتا ہے
پیاسی روحیں پیاس کا جنگل اور میں لکھتا جاتا ہوں

اُس کے پیار کی بوندیں ٹپ ٹپ دل میں گرتی رہتی ہیں
نرم، گداز و شوخ و چنچل اور میں لکھتا جاتا ہوں

ایک شعر

حُسن کی ختم نہ ہوتی ہوئی زنجیر ہو تم
میں تو سمجھا تھا کہ بس آخری تصویر ہو تم

السلام علیہ

برطرف کر کے تکلّف اک طرف ہوجایئے
مستقل مل جایئے یا مستقل کھو جایئے

کیا گلے شکوے، کہ کس نے کس کی دلداری نہ کی
فیصلہ کر ہی لیا ہے آپ نے، تو جایئے

میری پلکیں بھی بہت بوجھل ہیں گہری نیند سے
رات کافی ہوچکی ہے، آپ بھی سوجایئے

آپ سے اب کیا چھپانا،آپ کوئی غیر ہیں
ہو چکا ہوں میں کسی کا، آپ بھی ہو جایئے

موت کی آغوش میں گِریہ کُناں ہے زندگی
آیئے، دو چار آنسو آپ بھی رو جایئے

شاعری کارِ جنوں ہے، آپ کے بس کی نہیں
وقت پر بستر سے اُٹھئے، وقت پر سو جایئے

ایک شعر

قبول اب کوئی صورت نہیں تمہاری بھی
مجھے کسی کی ضرورت نہیں تمہاری بھی

السلام علیہ

اِسی آسرے پر جیے جائیں گے
گریباں کسی دن سیئے جائیں گے

میاں ہم سے کوئی سخن مت رکھو
کوئی بات دل میں لیے جائیں گے

کبھی بھولے بھٹکے تری بزم میں
گئے بھی تو کس کے لیے جائیں گے

تم اپنی سی تقریر کرتے رہو
ہم اپنی سی باتیں کیے جائیں گے
بتا اے نگاہِ فسوں گر بتا
پیالے سے کب تک پیئے جائیں گے

اُجڑنے نہ دیں گے یہ بزمِ سخن
بہم ساز و ساماں کیے جائیں گے

لکھو گے اگر داستانِ وفا
یہ بازو قلم کردیئے جائیں گے

ایک شعر

ہمیشہ جاہ و منصب یاد رکھا
مگر تم نے ہمیں کب یاد رکھا

علیہ السلام

آئی ہے یاد اُس کی، پیروں پہ اپنے چل کے
اے دل ذرا سنبھل کے، اے دل ذرا سنبھل کے

وہ رنگ، وہ نشہ تھا، مستی میں جس کی آکر
کتنے ہی رنگ جھلکے، کتنے ہی جام چھلکے

کیا خواب تھا کہ جس نے نیندیں اُڑا کے رکھ دیں
آنچل تھا آئینہ تھا یا پھول تھے کنول کے

ہونٹوں سے جیسے کوئی پھولوں کو چومتا ہے
اُس بُت نے ہاتھ چومے تصویر سے نکل کے

حُسنِ گریز پا سے سیکھے ہیں میں نے اے دل
آداب مثنوی کے، تیور نئی غزل کے

اے ابرِ وحشتِ غم، اے شام کی اُداسی
گریہ کناں ہوں تنہا، تُو بھی ہے ساتھ بلکہ

راہِ وفا پہ چلنا آسان ہے کہ مشکل
دیکھو تو ساتھ میرے دوچار گام چل کے

اے یاد کے مسافر تجھ کو سلام میرا
آخر کو بجھ گیا دل مانندِ شمع جل کے

ایک شعر

نیا نیا ہوں ابھی حالت جدائی میں
پلٹ پلٹ کے تری سمت دیکھتا ہوں ابھی

ہجر آشوب

گئی کیا نامرادانہ گئی کیا
ثریا ! میری رخسانہ گئی کیا

انانا تُو بتا عشتاریہ سے
مری تاریخ بیگانہ گئی کیا

زُلیخا تجھ کو یوسف کی قسم ہے
ہوس، بے عشقِ نذرانہ گئی کیا

بھُمیکا تم بتاؤ، تم بتاؤ
محبت بے مسیحانہ گئی کیا

فریدآباد سے دلّی گئی تھی
وہاں سے پھر وہ ہریانہ گئی کیا

محبت آگئی تھی گنگاجل تک
پلٹ کر پھر وہ ننکانہ گئی کیا

ارے کیوپڈ تجھے معلوم ہو گا
مری وینس بے افسانہ گئی کیا

اِدھر آ ایفروڈائٹ، تُو اِدھر آ
لباسِ بے لباسانہ گئی کیا

رَتی تُو ہی بتا، مجھ کو بتا دے
بسنتی بے بہارانہ گئی کیا

مرے بھنبھور اچھا تُو بتادے
مری سسّی شکیبانہ گئی کیا

بتا سَوسن مجھے تُو ہی بتا کچھ
مری سُنبل جداگانہ گئی کیا

بدن کی موج بے ساحل رہی کیا
یہ روحِ روح بیگانہ گئی کیا

ارے ہتّار موجِ نیل سے پوچھ
مری بسطاط فرزانہ گئی کیا

پڑی ہے تُو کہاں پر منہ لپیٹے
نسیمِ صبح رندانہ گئی کیا

کمی ہے سازِ دل کی نغمگی میں
ارے کیا میری نغمانہ گئی کیا

کسی کو کچھ خبر ہے یا نہیں ہے
وہ اپنے پَن سے بیگانہ گئی کیا

عزیزِ مصر کو شاید خبر ہو
رفیقِ دل، حریفانہ گئی کیا

وہ شمعِ جان و دل آخر کہاں ہے
گئی تو مثلِ پروانہ گئی کیا

ابھی نکلی تھی غم کے میکدے سے
دوبارہ سُوئے میخانہ گئی کیا

کہاں ہیں حافظ و رومی کہاں ہیں
وہ موجِ شعر، رندانہ گئی کیا

چلو اُردو سے چل کر پوچھتے ہیں
زبانِ میرِ میخانہ گئی کیا

گری تھی زخم کی کھڑکی سے اک دن
مسیحائی مریضانہ گئی کیا

وہ میری جان و دل کی بادشاہی
مرے دل سے فقیرانہ گئی کیا

پڑی تھی الگنی پہ دھوپ اَوڑھے

وہ رازِ محرمِ خانہ گئی کیا

برنگِ سبزہ و گُل، مثلِ انجم
خموشی سے خطیبانہ گئی کیا

علیہ السلام

یہ جو تازہ ستم ہُوئے ہُوئے ہیں
ہاتھ سینے پہ ہم دھرے ہُوئے ہیں

آج دستک نہ دل پہ دے کوئی
ہم نہیں ہیں، کہیں گئے ہُوئے ہیں

ڈھونڈ لیجے ہمیں کہ دل کے قریب
راستے میں کہیں رُکے ہُوئے ہیں

خالی خالی اُداس اُداس آنکھیں
یہ پیالے ابھی بھَرے ہُوئے ہیں

ہوگیا سامنا تو کیا ہوگا
اپنے ڈر سے کہیں چھُپے ہُوئے ہیں

ضبطِ گریہ میں دن بسر ہوا ہے
شہرِ گریہ میں رت جگے ہُوئے ہیں

عکس، شیشے سے ہیں بنائے گئے
آئینے سنگ سے بنے ہوئے ہیں

دو قدم پر ہے آخری منزل
پاؤں زنجیر سے بندھے ہُوئے ہیں

تیری یادوں کے جاں نثار چراغ
جل رہے ہیں مگر بجھے ہُوئے ہیں

راس آتی نہیں ہے گرمیء عشق
شمع رُو موم سے بنے ہُوئے ہیں

کوچۂ شہرِ میرؔ میں ہم بھی
سر جھکائے میاں کھڑے ہُوئے ہیں

میرؔ صاحب ! توجہ فرمائیں
آج ہم بھی بہت دُکھے ہُوئے ہیں

علیہ السلام

حال کہیں گے سب تم سے
بات کریں گے جب تم سے

بات ہے، میرے دل کی بات
پُوچھ رہے ہیں سب تم سے

کیسے جان چھڑاتے ہیں
سیکھ رہا ہوں ڈھب تم سے

کہہ دوں اپنے دل کی بات
سوچ رہا ہوں اب تم سے

آنکھ نے دل کی بات کہی
یاد نہیں ہے کب تم سے

اتنی گہری خاموشی
بات ہوئی ہے اب تم سے

ملتے جلتے رہتے ہیں
ایک ہی کیا، سب تم سے

میری دیکھا دیکھی سب

بات کریں گے اب تم سے

کس سے باتیں کرتے ہو
پوچھ رہی ہے شب تم سے

علیہ السلام

کاش پہلی سی بات ہوجائے
کوئی اچھی سی بات ہوجائے

پیاری پیاری ہے آپ کی صُورت
کوئی پیاری سی بات ہوجائے

جتنی گہری ہیں آپ کی آنکھیں
اُتنی گہری سی بات ہوجائے

کہیے، کہہ دیجیے، جو ہے دل میں
آج سچی سی بات ہوجائے

آؤ تھوڑا سا مل گیا ہے وقت
آؤ تھوڑی سی بات ہوجائے

آؤ میرے ذرا قریب تو آؤ
ایک چھوٹی سی بات ہوجائے

چوڑیوں کی کھنک یہ کہتی ہے
کھنکھناتی سی بات ہوجائے

خامشی گنگنا رہی ہے صبا
گنگناتی سی بات ہو جائے

سب کا دلدار ہے، دلدار بھی ایسا ویسا
اک مرا یار ہے اور یار بھی ایسا ویسا

دشمنِ جاں بھی نہیں کوئی برابر اُس کے
اور مرا حاشیہ بردار بھی ایسا ویسا

بے تعلق ہی سہی، اُس کو مگر ہے مجھ سے
اک سروکار، سروکار بھی ایسا ویسا

اُس کا لہجہ کہ بہت سادہ و معصوم سہی
ہے فُسوں کار، فُسوں کار بھی ایسا ویسا

ذوقؔ سے اُس کو عقیدت ہے کہ اللہ اللہ
اور غالبؔ کا طرف دار بھی ایسا ویسا

کیا زمانہ تھا کہ جب اہلِ ہوس کے نزدیک
کوئی معیار تھا، معیار بھی ایسا ویسا

میں بھی تمثیل نگاری میں بہت آگے تھا
وہ بھی فنکار تھا، فنکار بھی ایسا ویسا

کوئی افتاد پڑی تھی کہ ابھی تک چُپ تھا
اِک سخن کار، سخن کار بھی ایسا ویسا

ایک تھی جُرأتِ انکار کہ ایسی ویسی
ایک دربار تھا، دربار بھی ایسا ویسا

جس کا شاہوں کی نظر میں کوئی کردار نہ تھا
ایک کردار تھا، کردار بھی ایسا ویسا

ایک اصرار تھا، اصرار بھی بیعت کے لیے
ایک انکار تھا، انکار بھی ایسا ویسا

دوشعر

خلوتِ خاص میں، مجمعِ عام میں، دل نہیں لگ رہا
دل نہیں لگ رہا، اب کسی کام میں، دل نہیں لگ رہا

تشنگی ہے کہ اب ماورائے طلب اور اِس کا سبب
بس یہی ہے کہ اب، مینا و جام میں، دل نہیں لگ رہا

السلام علیہ

ترا نیاز مند ہوں، نیاز کے بغیر بھی
دلیل کے بغیر بھی، جواز کے بغیر بھی

مثال کیا کہ سربسر، ترا وجود شاعری
کلام کے بغیر بھی، بیاض کے بغیر بھی

تری طلب کا فاصلہ، خلش نے طے کرا دیا
سلوک کے بغیر بھی، لحاظ کے بغیر بھی

گزر رہی تھی زندگی، گزر رہی ہے زندگی
نشیب کے بغیر بھی، فراز کے بغیر بھی

تری نگاہِ خود نگر دلوں کو مات کر گئی
لڑائی کے بغیر بھی، محاذ کے بغیر بھی

رَوا ہے عشق میں رَوا مگر یہ سجدۂ وفا
اذان کے بغیر بھی، نماز کے بغیر بھی

ایک شعر

میں تو وہ ہوں کہ اگر میری محبت میں کوئی
اپنا مذہب بھی بدل دے تو میں کافر ہوجاؤں

علیہ السلام

کبھی چمپا، کبھی چنبیلی ہو
کون ہو، کیا کوئی پہیلی ہو

ایسے بیٹھی ہو سر جھکائے ہوئے
جیسے دلہن نئی نویلی ہو

تم نکل آئیں جان محفل کی
میں تو سمجھا تھا تم اکیلی ہو

شہر کا شہر آہ بھرتا ہے
جانے کس کس کے دل سے کھیلی ہو

تم کو میری، مجھے تمھاری تلاش
میں معما ہوں، تم پہیلی ہو

اے پری پیکر و جمالِ جمال
اور کس کس کی تم سہیلی ہو

ایک شعر

تم نے کہا تھا آؤ گے تم تھوڑی دیر میں
تھوڑی سی دیر کو بھی بڑی دیر ہوگئی

ٹھہریئے، رُک جایئے، رُک جایئے، مت جایئے
آج بس میرے لئے، رُک جایئے، مت جایئے

دل کی دھڑکن رُک گئی، جب اُس نے مجھ سے یہ کہا
بات سنئے، دیکھئے، رُک جایئے، مت جایئے

دیکھئے، میری کھُلی بانہوں کی جانب دیکھئے
چھوڑیئے، مت سوچئے، رُک جایئے، مت جایئے

اپنے دل سے پوچھ لیجے ، فیصلہ ہوجائے گا
منہ نہ دل سے موڑیئے، رُک جایئے، مت جایئے

سوچئے یہ رات شاید پھر نہ آئے گی کبھی
وسوسوں کو چھوڑیئے، رُک جایئے، مت جایئے

جایئے گا اِس اندھیری رات میں آخر کہاں
روشنی میں آیئے، رُک جایئے، مت جایئے

آیئے اپنی طرف سے، آیئے اپنی طرف
آیئے، مت جایئے، رُک جایئے، مت جایئے

دیکھئے قدموں کی لغزش، دیکھئے چہرے کا رنگ
خود کو مت سمجھائیے، رُک جائیے، مت جائیے

؀

جو تجھ سے لوگ وابستہ ہوئے آہستہ آہستہ
تری محفل میں ہم تنہا ہوئے آہستہ آہستہ

مسلسل دیکھنا اُس سادہ رُو کو رنگ لے آیا
معانی حُسن میں پیدا ہوئے آہستہ آہستہ

نگاہوں ہی نگاہوں میں چھڑی اک بحثِ لاحاصل
سخن وہ تھے کہ ناگفتہ ہوئے آہستہ آہستہ

اچانک فیصلہ تُو نے کیا ترکِ مراسم کا
مگر ہم تجھ سے برگشتہ ہوئے آہستہ آہستہ

نہیں دیکھا جو تُو نے بزم میں قصداً مری جانب
ہزاروں مسئلے پیدا ہوئے آہستہ آہستہ

؟

حیران جایئے نہ پریشان جایئے
جاتی ہے جیسے جان، مری جان جایئے

جی چاہتا ہے ناز اُٹھاؤں کسی کے میں
ایسا کریں کہ آپ بُرا مان جایئے

مت پوچھیے کہ کون ہے وہ جانِ انجمن
حالت ہماری دیکھیے ، پہچان جایئے

رکھیں گے دل پہ بوجھ، تو جایا نہ جائے گا
کوئے وفا سے بے سر و سامان جایئے

مہمان کی طرح مرے دل میں رہے تھے آپ
جاتے ہیں جس طرح سبھی مہمان، جایئے

☆

دل میں آنا پسند کیجئے گا
ناز اُٹھانا پسند کیجئے گا

دل کی جانب کوئی نہیں آتا
آپ آنا پسند کیجئے گا

منتظر ہے بہار کا موسم
مسکرانا پسند کیجئے گا

باغ میں چل رہی ہے بادِ نسیم
لہلانا پسند کیجئے گا

باغ ہے اور باغ بھی دل کا
گُل کھِلانا پسند کیجئے گا

آپ کس کو پسند کرتی ہیں
کچھ بتانا پسند کیجئے گا

معذرت چاہتا ہوں عشق سے میں
دوستانہ پسند کیجئے گا

آپ اِن نیم باز آنکھوں سے
باز آنا پسند کیجئے گا

آپ بھی کیا مری خوشی کے لیے
غم منانا پسند کیجئے گا

اچھا ! چلئے یہ دل لگی ہی سہی
دل لگانا پسند کیجئے گا

بھولتا جا رہا ہوں آپ کو میں
یاد آنا پسند کیجئے گا

ایک شعر

گھر کو لَوٹوں تو اداسی یہ قدم روکتی ہے
اور وہ دیر سے آنے پہ مجھے ٹوکتی ہے

؟السلام علیہ

رَوا نشے میں ہوئے، نارَوا نشے میں ہوئے
نشے میں خوش ہوئے تجھ سے، خفا نشے میں ہوئے

جو آدمی کے نشے میں تھے، آدمی ہی رہے
جو بندگانِ خدا تھے، خدا نشے میں ہوئے

نہ جانے تیری محبت میں کیا نشہ تھا کہ ہم
ملے تھے ہوش میں لیکن جدا نشے میں ہوئے

نہ جانے کتنے ہی پیماں نشے میں ٹوٹ گئے
نہ جانے کتنے ہی وعدے وفا نشے میں ہوئے
سرورِ تشنہ لبی تھا کہ ہوش ہی نہ رہا
رہے اسیرِ طلب یا رِہا نشے میں ہوئے

جو بات ہوش میں کہنے کی تھی، نشے میں کہی
جو قرض تھے دل وجاں پر، ادا نشے میں ہوئے

ہوئے عبا و قبا کے نشے میں کھیل تمام
تماشا ہائے جزا و سزا نشے میں ہوئے

ایک شعر

یہ ہم نہیں تھے کہ جو روز و شب نشے میں رہے
جنہیں بھی ہوش تھا، وہ سب کے سب نشے میں رہے

عليه السلام

اپنی خبر نہ تیری خبر میں نشے میں ہوں
تُو ہے اُدھر نشے میں اِدھر میں نشے میں ہوں

جو کہہ رہا ہوں مان لو سچ ہے کہ جھوٹ ہے
تم تو نہیں نشے میں اگر میں نشے میں ہوں

میرے نپے تلے ہوئے قدموں کو یوں نہ دیکھ

ہوش و حواس میں ہوں، مگر میں نشے میں ہوں

ردیف ثانی

ہاتھوں میں کوئی جام نہ ساغر نشے میں ہوں
تیری طرح سے میں بھی سراسر نشے میں ہوں
ساقی سے ہے غرض نہ مجھے دورِ جام سے
میں اپنی تشنگی کے برابر نشے میں ہوں

کھاتا ہوں پیچ و تاب میں اپنی ہی لہر میں
دریا ہوں مثلِ موجِ سمندر نشے میں ہوں

ساغر اُٹھا، صراحی ہٹا، میکدہ سنبھال
ساقی تری شراب سے بڑھ کر نشے میں ہوں

ایک شعر

ساقی اِدھر اُدھر تھا پیالے اِدھر اُدھر
ہم نے بھی کتنے جام اُچھالے اِدھر اُدھر

ہمیشہ نشے میں رہو

(ماخوذ : بودلیئر)

نشے میں رہو
اور ہمیشہ نشے میں رہو
نشے کے سوا اب یہاں کچھ نہیں
یہ زمیں کچھ نہیں
آسماں کچھ نہیں

یہ یقیں کچھ نہیں

یہ گماں کچھ نہیں

سب نشہ ہے

نشے میں رہو

اور ہمیشہ نشے میں رہو

نشے میں ؟

مگر کس نشے میں

کسی شاعری کے

مئے تلخ کے

یا کسی خواب کے

کس نشے میں ؟

نشے میں رہو

بس کسی بھی نشے میں رہو

کبھی آنکھ کھُل جائے

ٹھٹھری ہوئی ساعتِ رفتگاں میں

تو بس،

اِک مئے تلخ کے جام سے

کُن کے آغاز سے

کُن کے انجام سے

طنز و دُشنام سے

صبح سے شام سے

کھینچتے ہی رہو

اک سرورِ غمِ آگہی

اور ہمیشہ نشے میں رہو

ہواؤں سے پوچھو

کسی لہر سے، موج سے

یا ستاروں کے جھُرمٹ

پرندوں کی پرواز

اور ساعتِ وقت سے

ساعتِ مہرباں اور نامہرباں سے

خیالوں سے

یا زیرِ لب گنگناتی ہوئی

آہٹوں سے

کہ ان وقت کے بولتے چالتے

گھنگروؤں سے

کوئی رنگ کھینچو

کوئی بات پوچھو

کسی رنگ کے

یا کسی خواب کے

یا کسی بات کے ہی نشے میں رہو

نشے میں رہو

اور ہمیشہ نشے میں رہو

گھڑی، موج

پرواز کرتی ہوئی آہٹوں

زیرِ لب

مسکراتی ہوئی درد کی ساعتوں
گزرتے ہوئے خواب لمحوں کی
چبھتی ہوئی جان لیوا اذیت کے
نشّے میں ڈوبے رہو
نشے میں رہو
اور
ہمیشہ نشے میں رہو

تم قیامت نہیں تباہی ہو

کون ہو، کیا ہو، یہ نہیں معلوم
یورپی ہو کہ ایشیائی ہو

ہو اِسی آب و ِگل کی پروردہ
یا پرستاں سے اُڑ کے آئی ہو

ایسی آنکھیں کہیں نہیں دیکھیں
تم یہ آنکھیں کہاں سے لائی ہو

کس نے گوندھی ہے آگ میں مٹی
کیسی ترکیب کیمائی ہو

بنتِ آدم ہو یا پری زادی
یا کسی سلطنت کی شہزادی

کس کو برباد کرنے نکلی ہو
کس پہ بیداد کرنے نکلی ہو

اے جمالِ جمال و دل آراء
حُسن کی آخری گواہی ہو

حشر ساماں ہو آئینے کے لیے
تم قیامت نہیں تباہی ہو

مدھو بالا

مدھو بالا کی یہ تصویر اچھی ہے
مگر اس دل میں جو تصویر رہتی ہے
وہی تصویر میری زندگی ہے
اور اِس تصویر نے

مجھ کو بھی اِک تصویر کر ڈالا
نہ اب پلکیں جھپکتی ہیں
نہ اب آنکھوں سے کوئی اشک گرتا ہے
نہ اب ہونٹوں پہ لرزش ہے
نہ اب دل یہ دھڑکتا ہے

اپنے دل سے پوچھو

اپنے دل سے پوچھو
شاید کوئی رنگ سمٹ کر
بانہوں میں آجائے
شاید کوئی خواب پلٹ کر
آنکھوں میں آجائے
شاید کوئی حرفِ تمنا
ہونٹوں پر آجائے

شاید کوئی چاہنے والا

سرگوشی کر جائے

شاید کوئی رنگِ تمنا

تم کو کچھ سمجھائے

چپکے سے کہہ جائے

اپنے دل سے پوچھو

شاید کچھ کہہ جائے

سو جاؤ

مری تلاش میں

راتوں کو جاگتی کیوں ہو

تم اپنے آپ کو کیوں کھو رہی ہو

سو جاؤ !

تمہارے خوابوں خیالوں کے

آس پاس ہوں میں

یہ کس کے ہجر میں

تم رو رہی ہو

سو جاؤ !

مرا خیال ہے

اب نیند آ گئی ہے تمھیں

میرا خیال ہے

تم سو رہی ہو

سو جاؤ !

رشتہء خواب

یوں سمجھ لو کہ ۔۔بس ۔۔کیا کہوں

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا

اک عجب رشتہء خواب سے

منسلک ہے

جسے ٹوٹ کر چاہتا ہے مرا دل

مری روح

میری عمرِ رواں

اُس کے بازو پہ سر رکھ کے

جب تک نہ لیٹوں

مجھے نیند آتی نہیں

اور پھر نیند میں بھی

وہی چشم و لب

جب تلک مسکراتے نہیں

آنکھ کھلتی نہیں

اک عجب رشتۂ خواب سے

منسلک ہے

جسے چاہتا ہے مرا دل

بہت ٹوٹ کر

مری جان

کیا تم اسے جانتی ہو ؟

مری جاں !

محبت کا پیکر ہے وہ سر بسر

نفاست کا خواب گراں مایہ ہے
بہت دُکھ اُٹھائے ہیں اُس نے مگر
اپنے ہونٹوں سے مُسکان جانے نہ دی
گُم شدہ خواب کے ڈھیر میں دَب کے بھی
اپنے ہونے کی پہچان جانے نہ دی

دیکھنا ! یہ کہیں تصویر تمہاری تو نہیں

خواب کی جھیل میں
ڈُوبا ہوا مدّھم لہجہ
سانس کی ڈور سے لپٹی ہوئی
بے نام مہک
زیرِ لب
حرف و معانی کا پُراسرار بہاؤ

کھلکھلاتی ہوئی

آواز کی افسردہ لہک

گُل کھلاتی ہوئی

یہ بادِ بہاری تو نہیں

دیکھنا !

یہ کہیں تصویر تمہاری تو نہیں

قبائے عشق

ہمارے اور تمہارے درمیاں جو فاصلہ ہے

اِس کی حد بندی

لکیروں نے ہی کی ہے

لکیریں،

دائروں کی سرحدیں ہیں

چلو !

اِن دائروں کو توڑ کر
آگے نکلتے ہیں
وصال و ہجر کی سرحد سے بھی
آگے نکلتے ہیں
مگر، اے جانِ جاں
تم جسم ہو اب !
اور سرحدِ ادراک سے آگے جو رستہ ہے
وہ بس اِک روح کی دستک سے کھلتا ہے
مبارک ہو تمہیں
یہ جسم،
ممکن ہو تو میری روح لوٹا دو
کبھی یہ جسم
تم سے تنگ آ جائے
تو آ جانا
قبائے عشق !
میری روح سے لپٹی ہوئی ہے

قبائے عشق لے جانا

شبنمی آنچ

تیری آنکھوں میں
وہ آتش ہے کہ میں
گرمیٔ سوزِ محبت سے
سلگ اُٹھّا ہوں
تیرے ہونٹوں کے
دہکتے ہوئے انگاروں پر

میں نے بے ساختہ
جب ہونٹ رکھے
شبنمی آنچ نے
پگھلا دیا لاوا سا مجھے
میں کوئی اور لگا
اپنے علاوہ سا مجھے

بادل ہیں یہ ہاتھ نہیں
منہ دیکھے کی بات نہیں

عشق سے وقت گریزاں ہے

وقت کی کچھ اوقات نہیں

جیسا تھا، میں ویسا ہوں
ایسی کوئی بات نہیں

سب ہیں سب کے ساتھ مگر
کوئی کسی کے ساتھ نہیں

بات تو یہ ہے، لیکن، خیر
جاؤ کوئی بات نہیں

جتنی گہری تنہائی
اُتنی گہری ذات نہیں

چاند ستارے روشن ہیں
لیکن ویسی رات نہیں

رات کی رانی پہلے سی
پہلے جیسی بات نہیں

تیرے سامنے رنگ جمائیں
پھولوں کی اوقات نہیں

ہم نے دنیا دیکھی ہے
تیرے جیسی بات نہیں

تجھ میں دنیا داری کی
بات تو ہے، پر بات نہیں

ایک شعر

اک تو ویسے ہی تجھے سوچ کے بھر آئی تھی آنکھ
اور ایسے میں یہ برسات بھی ہونی تھی ابھی

نذرِ میرؔ

تیرا پروانہ جاں نثار آیا
آیا اے شمع ! اعتبار آیا

ہو رہے چُپ جو بولنے والے
آستیں کو لہو پکار آیا

''موسم آیا تو نخلِ دار پہ میرؔ''
برگ آیا نہ کوئی بار آیا

تیرے آنے کا اعتبار نہ تھا
تُو نہ آیا تو اعتبار آیا

گاہ و بے گاہ آنکھ پڑتی رہی
جا بجا کوئے حُسنِ یار آیا

غم پہ بے ساختہ ہنسی آئی
مسکراہٹ پہ اعتبار آیا

بے خیالی میں بھی خیال ترا
بار بار آیا، بار بار آیا

یاد آئی تو اور یاد آئی
پیار آیا تو اور پیار آیا

لے یقیں کرلیا محبت کا
لے مجھے تیرا اعتبار آیا

جس کے کوچے میں تھی بیدل کی دکاں
(نذرِ غالبؔ)

اکبر آباد کی گلیاں بھی پرائی نکلیں
اور دلّی کے وہ کوچے بھی پرائے نکلے
لوگ کہتے ہیں کہ اوراق مصوّر تھے جہاں
بلّی ماراں کے محلے کی گلی قاسم جان
اجنبی نکلی، پرائی نکلی

لوگ کہتے ہیں کہ غالبؔ بھی وہیں رہتا تھا

چاندنی چوک سے کچھ دور سڑک کے نزدیک
حلوہ پوری کی دکانوں سے ذرا سا آگے
اک پرانی سی حویلی کے جو آثار ابھی باقی ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ غالبؔ بھی یہیں رہتا تھا
غالبؔ بھی یہیں رہتا تھا۔؟
جی نہیں
اسد اللہ یہاں رہتا تھا
جس کے آبا تھے سپہ گر
اور غالبؔ جسے کہتے ہیں
وہ رہتا تھا کہیں اور کسی کوچے میں
جس کی گلیوں میں تھا رومی کا مکاں
جس کے کوچے میں تھی بیدل کی دکاں
جس کے نکڑ پہ تھی،
آوارہ مزاجی کی وہ ٹال

لکڑیاں چنتا تھا،

جس جا کوئی انمول خیال

جس کے ہر موڑ پہ تقدیر بکف بیٹھی تھی

شاعری،

خواب کی اَوڑھے ہوئے شال

اُس محلے میں کہ رہتا تھا جہاں حرف نوا

اُس محلے میں نہ دربار، نہ شاہوں کا وجود

تھی اگر کچھ

تو نئے خواب کی تصویرِ نمود

بلّی ماراں میں تو اک جسم نمار رہتا تھا

اسد اللہ وہاں رہتا تھا

غالبِؔ شعلۂ صد رنگ کہاں رہتا تھا۔؟

نذرِ قمرؔ جلالوی

اب کے وہ درد دل میں ہمارے اُٹھا کہ بس
قصہ تمام ہوگیا ، ایسا لگا کہ بس

رُکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی غم کی لہر

اس نے گلے لگا کے مجھے کہہ دیا، کہ بس

بس ایک ہی نگاہ میں طوفان تھم گیا
پلکیں اُٹھا کے اُس نے اشارہ کیا، کہ بس

وہ حُسن تھا کہ آنکھ ٹھہرتی نہ تھی کہیں
وہ رنگِ حُسن تھا پسِ بندِ قبا کہ بس
دیکھا نہ ایک بار بھی اُس نے مری طرف
پھر اُس کے بعد ایسا تماشا کیا، کہ بس

قِرطاس دل پہ کچھ نہیں لکھا تمہارے بعد
لکھ کر تمھارا نام قلم رکھ دیا، کہ بس

ایک شعر

واقف نہیں ہوں گردشِ لیل ونہار سے
میں بھی نہیں ملا ہوں ابھی اُس بہار سے

نذرِ فیضؔ

ایک دھڑکا اور ہے خاطر مداراتوں کے بعد
پھر بچھڑ جائیں گے ہم اتنی ملاقاتوں کے بعد

ایک آہِ سرد کھینچی اور آنسو تھم گئے

چل پڑی ٹھنڈی ہوا ساون کی برساتوں کے بعد

دیر تک ہنس ہنس کے باتیں کیں، گِلے شکوے کیے
چھا گئی پھر ایک گہری خامشی باتوں کے بعد

کھُل رہی تھی زُلفِ پیچاں، اور پھر کھُل ہی گئی
کچھ ملاقاتوں سے پہلے، کچھ ملاقاتوں کے بعد

یہ جو تُو نے رُخ سے زُلفوں کو ہٹایا ہے ابھی
دن نکل آیا ہے چپکے سے، کئی راتوں کے بعد

ایک دل ہے اور اِس کے چاہنے والے بہت
ہاتھ تھامیں اور کس کس کا ترے ہاتھوں کے بعد

بے قراری کا وہی عالم ہے کچھ مت پوچھیے

کیا ملاقاتوں سے پہلے، کیا ملاقاتوں کے بعد

آج آیا ہے مجھے اُس سے بچھڑنے کا یقیں
آج گہری نیند آئی ہے کئی راتوں کے بعد

آج نکلی ہے سرِ ساحل کوئی موجِ خیال
آج بکھرے ہیں دھنک کے رنگ برساتوں کے
بعد

آج اُس نے جاتے جاتے، جانے کیا دل سے کہا
آج ہم روئے بہت اِتنی مداراتوں کے بعد

شکوہ ہائے بے رخی کرتے تو کس منہ سے صباؔ
خامشی سے لوٹ آئے ہم مناجاتوں کے بعد

ایک شعر

درد وہ ہے کہ مسیحائی تو کیا کیجئے گا
آج کی رات گزرنے کی دعا کیجئے گا

نذرِ فراز

میکدے ہیں نہ وہ ساقی نہ وہ رنداں جاناں
ایسی برہم تو نہ تھی محفلِ یاراں جاناں

ایسا سیلابِ بلا تھا کہ سبھی ڈوب گئے
دشت کے دشت، گلستاں کے گلستاں جاناں

جرأتِ شوق یہ کہتی ہے کہ آغاز تو کر
کھُلا رہتا ہے ہمیشہ درِ امکاں جاناں

جاتے جاتے جو پلٹ کر مجھے دیکھا تُو نے
لوٹ آئی ہے، مری عمرِ گریزاں جاناں

چاکِ دامان و گریباں جو رَفو تُو نے کیا
آ گئے یاد کئی چاک گریباں جاناں

تُو بھی رہتا ہے کسی سوچ میں اُلجھا اُلجھا
ہم بھی کچھ سوچ کے رہتے ہیں پشیماں جاناں

جل اُٹھے تیرے شبستاں میں بھی یادوں کے چراغ

کرلیا ہم نے بھی پلکوں پہ چراغاں جاناں

آنکھ دیکھے ہی چلی جاتی ہے رستہ تیرا
''دل پُکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں''

علیہ السلام

پسِ پردہ بھی تو ہیں زخم نمایاں جاناں
اب سِلے یا نہ سِلے چاک گریباں جاناں

منزلِ درد سے آگے نکل آئی ہے خلش
اب پُکارے نہ پُکارے کوئی جاناں جاناں

اب مسیحائی کو آئے کہ نہ آئے کوئی
زخم ہوتے ہیں تو ہوں بے سر و ساماں جاناں

کون سمجھے گا مرے دل کی اُداسی کا سبب
کون دیکھے گا ترا دیدۂ گریاں جاناں

ہوسِ عشق کا الزام لیے پھرتے ہیں
تُو زُلیخا ہے ، نہ میں یوسفِ کنعاں جاناں

تُو نہیں ہے تو نہیں ہے کوئی موسم دل کا
اب اگر آبھی گیا موسمِ باراں جاناں

یہ تو، تُو تھا کہ ترے سامنے ہم رو بھی دیئے

عمر گزری ہے پسِ دامن و مژگاں جاناں

عشق وہ حسن کہ اپنے ہی نشے میں گم ہے
دل وہ کافر کہ نہ ہندو نہ مسلماں جاناں

دل کے آنگن میں جو دیوار اٹھادی ہے توکیا
دونوں جانب سے صدا آتی ہے جاناں جاناں

جالبؔ یاد آتا ہے
(عوامی شاعر حبیب جالبؔ کی یاد میں)

کبھی میں چلچلاتی دھوپ میں
بے سائباں رستوں، گلی کوچوں
محلوں اور اُجڑی بستیوں کے بیچ سے ہو کر
گزرتا ہوں

تو جالبؔ یاد آتا ہے

کوئی آمرِ اگر قدغن لگائے
حرف وصورت پر
قلم کو قید کر لے
بولنے والوں کو
خاموشی کے زنداں میں دھکیلے
لگائے برسرِ بازار کوڑے
اُڑا دے دھجیاں دستور کی
اور چھین لے جینے کی آزادی
اور ایسے میں
اگر سب بولنے والے
کہیں چھپ جائیں
خاموشی کے صحرا میں
تو جالبؔ یاد آتا ہے

کبھی جمہور کی چادر میں لپٹی
کرسیوں کے خوف سے
اک مصلحت آمیز خاموشی کو
ایوانوں کی چوکھٹ پر
جبیں سائی کا تحفہ دینے والے یاد آتے ہیں
تو جالبؔ یاد آتا ہے

وزیروں اور مشیروں کی
بھیانک جی حضوری کے سبب
خالی تجوری میں
عوام النّاس کی آہوں کے سکّوں سے
چھنکتے خواب کی فریاد سنتا ہوں
تو جالبؔ یاد آتا ہے

گریبانوں میں جب
بخیہ گری کی فصل کا موسم اترتا ہے
تو پھر حاکم کے ہرکارے

ہر اِک شوریدہ سر کے خواب کی بولی لگاتے ہیں
بناتے ہیں نئے دستور خنجر آزمائی کے
اور ایسے میں
اگر کوئی گریباں چاک بھی
بے ضابطہ دستور کو تسلیم کر بیٹھے
تو جالبؔ یاد آتا ہے

اگر حوا کی بیٹی برسرِ دربار آ کر
ناچنے سے منع کر دے
اور اُس کے پاؤں کی زنجیر
آدابِ غلامی سے
اُسے واقف نہ کر پائے
تو جالبؔ یاد آتا ہے

کبھی میں کافی ہاؤس
ریستورانوں میں

ادیبوں، شاعروں اور ناقدینِ فن کو
انسانوں کی عظمت کے ترانے گانے والے
شاعروں پر مسکراتے دیکھ لیتا ہوں
تو جالبؔ یاد آتا ہے

فلسطین و عراق و لیبیا، لبنان و پاکستان
زمینِ مصری و کشمیری و افغان
لہو میں تر بہ تر ہے
اور کوئی بولنے والا نہیں ہے
نہیں ہو بولنے والا اگر کوئی
تو جالبؔ یاد آتا ہے

کبھی انصاف کی مسند سے
فریاد و فغاں کا شور اٹھتا ہے
نکل آتے ہیں جاں اپنی ہتھیلی پر لیے
جمہور کے پرچم
اور ایسے میں اگر کوئی قلم کو بیچ کر

اپنی تجوری بھرنے لگتا ہے
تو جالبؔ یاد آتا ہے

سڑک پر دندناتی، دوڑتی پھرتی
نئی کاروں کے پیچھے
بھاگتے بچوں کے ننگے پاؤں
اُن کے فاقہ کش چہرے
بدن پر دھجیاں
آنکھوں میں حسرت ناک ویرانی کا پَرتو
دیکھ لیتا ہوں
تو جالبؔ یاد آتا ہے
کبھی تنہائی کے عالم میں
بھُولے سے کسی کی یاد آ جائے
اُڑا لے جائے پتوں کی طرح
دل کو ہوائے دل
اور ایسے میں کسی کی

مہرباں زلفوں کا سایہ بھی گریزاں ہو
تو جالبؔ یاد آتا ہے

کبھی جب رات کے
تاریک سنّاٹے کی چادر سے لپٹ کر
کوئی بچّی
بھوک سے فریاد کرتی ہے
کبھی جب سچ کے پاؤں میں
کوئی زنجیر پڑتی ہے
کبھی ویران چوکھٹ پر
کسی کی منتظر آنکھیں
کسی کا راستہ تکتے نہیں تھکتیں
تو ایسے میں
وہ دیوانہ ہمیشہ یاد آتا ہے
جو ایوانوں سے ٹکر لے کے
لکھتا ہی رہا ہر پل
وہی سچ

جس کے لکھنے پر
نہ جانے کتنے ہاتھوں کو
قلم کرتی رہی تاریخ
مگر تاریخ کی بازی گری
شاہوں کے مدفن میں سسکتی ہے
گداو بے نوا انسان کی آواز میں ڈھل کر
قلم کی رُوح سے جب بھی کبھی
حق گوئی کا نغمہ ابھرتا ہے
تو جالبؔ یاد آتا ہے

ؑ

تم سے نہیں ملے تو کسی سے نہیں ملے
ملنا بھی پڑ گیا، تو خوشی سے نہیں ملے

دنیا تو کیا کہ خود سے بھی کرتے رہے گریز
جب تک ملے کسی سے، کسی سے نہیں ملے

ہم اپنے دشمنوں سے گلے مل کے آ گئے
جس کے لیے گئے تھے اُسی سے نہیں ملے

آنکھیں وہی تو ہیں، جو مجھے ڈھونڈتی رہیں
صورت وہی تو ہے، جو کسی سے نہیں ملے
ملنے کو زندگی میں سبھی کچھ ملا مگر
تم مل گئے، تو لوگ خوشی سے نہیں ملے

دیکھو یہ دل ابھی سے بیاباں نورد ہے
ملنا نہ ہو جسے، وہ ابھی سے نہیں ملے

دراصل آدمی کا مقدّر ہے آدمی

کب تک یہاں پہ کوئی، کسی سے نہیں ملے

ایک شعر

جس طور سے ملتے تھے اُسی طور سے ملئے
بے رنگِ جنوں آپ کسی اور سے ملئے

علیہ السلام

میری آواز میں تُو بولتا ہے
اب میں سمجھا کہ لہو بولتا ہے

تیری بھیگی ہوئی پلکیں اور میں
ایک منظر لبِ جُو بولتا ہے

تجھ کو احساس نہیں ہے شاید
تیرے لہجے میں عدُو بولتا ہے

دل دھڑکنے کی بھی آواز نہیں
اِس کا مطلب ہے کہ تُو بولتا ہے
گفتگو ہے کہ خموشی کی تھکن
ہُو کا عالم ہے، کہ ہُو بولتا ہے

چاک رہنے دے گریباں یوں ہی
فائدہ کیا جو رَفُو بولتا ہے

ویسے ہم دونوں میں رشتہ کیا ہے

میری جانب سے بھی تُو بولتا ہے

ایک شعر

اک دوسرے سے جیسے کبھی پیار ہی نہ تھا
ایسے ملا ہے وہ کہ مرا یار ہی نہ تھا

? علیہ السلام

رقص کرتے تھے اُلجھتے ہوئے زنجیر سے ہاتھ
ہائے وہ پھول لُٹاتے ہوئے شمشیر سے ہاتھ

یوں دِکھاتے ہیں اُسے چاکِ گریباں اپنا
جیسے سچ مچ ہی نکل آئیں گے تصویر سے ہاتھ

بدحواسی کا یہ عالم کہ اُسے دیکھتے ہی
جانے کس رَو میں ملانے لگے رہگیر سے ہاتھ

رات بھر عالمِ وحشت میں لہو ہوتے رہے
صبح دم کھینچ لیا نالۂ دلگیر سے ہاتھ
لے ہمیں خاکِ تحیّر میں بکھرتا ہُوا دیکھ
لے اُٹھاتے ہیں ترے خواب کی تعبیر سے ہاتھ

اِس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو ہم کو
ہم ملاتے ہیں مری جاں ذرا تاخیر سے ہاتھ

ایک شعر

بیمار نہ پڑنے کی وجوہات میں شامل
اک خوفِ عیادت بھی ہے غربت کے علاوہ

☆☆☆

بچو کہ باطن و ظاہر تباہ کرتی ہے
حسد کی آگ ہے، چہرے سیاہ کرتی ہے

یہی کہ پوچھ رہی ہے حَسَب نَسَب تیرا
یہ خلق کون سا ایسا گناہ کرتی ہے

ستم ظریفیٔ چشمِ بہار تو دیکھو
تباہ کر کے مجھے، انتباہ کرتی ہے

اندھیرے بانٹنے والوں کو یہ خبر ہی نہیں
یہ تیرگی ہی مجھے مہر و ماہ کرتی ہے
نظامِ زر کے اَسیروں سے کیا معیشت ہو
کہ قاتلوں کی حفاظت سپاہ کرتی ہے

نہیں کہ سہل نہیں، اِس سے منحرف ہونا
یہ دل کی آنکھ ہے، دل کو گواہ کرتی ہے

ایک شعر

جیسے ملے ہو ایسے مکرّر ملو گے کیا
مل کر نہیں ملے تو بچھڑ کر ملو گے کیا

☐ علیہ السلام

محسوس کرو گے تو گزر جاؤ گے جاں سے
وہ حال ہے اندر سے کہ باہر ہے بیاں سے

وحشت کا یہ عالَم کہ پسِ چاکِ گریباں
رنجش ہے بہاروں سے، اُلجھتے ہیں خزاں سے

اِک عمر ہوئی اُس کے در و بام کو تکتے
آواز کوئی آئی یہاں سے، نہ وہاں سے

اُٹھتے ہیں تو دل بیٹھنے لگتا ہے سرِ بزم
بیٹھے ہیں تو اَب مر کے ہی اُٹھیں گے یہاں سے
ہر موڑ پہ وا ہیں مری آنکھوں کے دریچے
اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ جاتا ہے کہاں سے

کیا ناوکِ مژگاں سے رکھیں زخم کی اُمید
چلتے ہیں یہاں تیر کسی اور کماں سے

آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے عالَم مرے دل کا

مطلب ہے اِس عالم کو زباں سے، نہ بیاں سے

ایک شعر

فہرستِ عاشقان غزالاں میں پیش پیش
میرا بھی نام ہے مری قیمت لگایئے

؟الساِلعلیہٖ

ہے داد طلب زخمِ مسیحائی تو چُپ ہو
آواز اُٹھاؤ کہ یہ ہرجائی تو چُپ ہو

ویسے تو بہت دعویٰ تھا پامالیٔ شب تھا
اب حشر اُٹھانے کی گھڑی آئی تو چُپ ہو

گونجے گی صدائے دلِ پُرسوز بھی لیکن
یہ شور مچاتی ہوئی تنہائی تو چُپ ہو

کرتے تھے بہت تم در و دیوار سے باتیں
اَب کے شبِ مہتاب نہیں آئی تو چُپ ہو
لب بستہ تمناؤں کا منظر ہے مری جاں
پردہ بھی اٹھا دیں گے تماشائی تو چُپ ہو

غنچوں کی صدا، منتظرِ اذنِ صبا ہے
زخموں کو زباں دے کہ یہ پُروائی تو چُپ ہو

ایک شعر

کس نے دل کا چین ہے چھینا، کس نے نیند اڑا دی ہے
آدھی رات کی خاموشی نے پوری بات بتا دی ہے

☆

اُس نے آوارہ مزاجی کو نیا موڑ دیا
پا بہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا

اُس نے آنچل سے نکالی مری گم گشتہ بیاض

اور چپکے سے محبت کا وَرَق موڑ دیا

جانے والے نے ہمیشہ کی جدائی دے کر
دل کو آنکھوں میں دھڑکنے کے لیے چھوڑ دیا

ہم کو معلوم تھا انجامِ محبت ہم نے
آخری حرف سے پہلے ہی قلم توڑ دیا

❀

چل لغزشِ وصال کے امکاں سمیت چل
اُس انجمن میں اِک دلِ ناداں سمیت چل

اے موجۂ وصال کمیں گاہِ عشق سے
برگِ حنا پہ عمرِ گریزاں سمیت چل

تمثیلِ دلبری کا صلہ چاہیے اُسے
اب اُس کی سمت چاکِ گریباں سمیت چل

تجھ سے کہا نہ جائے گا تنہا وفا کا حال
صبحِ بہارِ غم، شبِ ہجراں سمیت چل
انجامِ کارِ عشق سے آغاز کی طرف
شامِ فراق و صبحِ نگاراں سمیت چل

اَب کیا دلِ گذشتہ پہ آئندگاں کی چال
فرشِ عزا ہے دامن و مژگاں سمیت چل

ایک شعر

ہوا تو کچھ بھی نہیں بس یہی ہوا ہے کہ ہم
ترے خیال میں وہم و گمان ہو گئے ہیں

علیہ السلام

پھول میں پھول، ستاروں میں ستارے ہوئے لوگ
تیرے ٹھکرائے ہوئے، میرے پکارے ہوئے

لوگ

ہم میں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے پھر بھی
کوئی تو بات ہے ایسی کہ ہمارے ہوئے لوگ

جس سے ملتے ہیں، اُسے اپنا بنا لیتے ہیں
چند لمحے ترِی صُحبت میں گزارے ہوئے لوگ

نشّہ ٹُوٹے گا تو گھبرا کے پلٹ آئیں گے
وہ بھی اپنے ہیں، جواب غیر کو پیارے ہوئے لوگ

زخم پروردہ ہے ناکامیٔ دل کا انجام
تجھ کو یہ سوچ کے جیتے نہیں ہارے ہوئے لوگ

جس سے کترا کے بکھرتے ہی چلے جاتے تھے
جمع آخر اُسی دریا کے کنارے ہوئے لوگ

آ نکلتے ہیں ترے شہر کی رونق کے لیے
گاہے گاہے تری نظروں سے اُتارے ہوئے لوگ

ہم تو سمجھے تھے کہ اِک ہم ہی چمک اُٹھیں گے
چاند نکلا تو لبِ بام ستارے ہوئے لوگ

بے وفائی کی بھی اِک حد ہے مری جان صبآ
تم کسی کے نہ ہوئے اور تمھارے ہوئے لوگ

علیہ السلام

وقت کے خواب سے آگے ہے سلامی میری
برق رفتار ہے آہستہ خرامی میری

اب جو بولا ہوں تو پڑنے لگے سینوں میں شگاف
کام آتی ہی نہ تھی نرم کلامی میری

میں نہ کہتا تھا کہ اک روز لہو بولے گا
خلق کی خلق نکل آئی ہے حامی میری

تلخ ہوتا ہی چلا جاتا ہوں لحہ لحہ
حُسن بنتی ہی چلی جاتی ہے خامی میری

☆

شفق شفق ترے آنچل میں بے وفائی کا رنگ
لہو لہو مری آنکھوں میں جگ ہنسائی کا رنگ

عبث عبث کسی صبحِ نشاط کی آمد

جَرَس جَرَس شبِ فردا کی رُونمائی کا رنگ

فُسوں فُسوں مری مانگی ہوئی وصال کی قید
جنوں جنوں تری بخشی ہوئی رِہائی کا رنگ

الگ الگ شبِ ہستی کی کہکشاں راہیں
جُدا جُدا غمِ دنیا سے آشنائی کا رنگ

نگوں نگوں سرِ مقتل نشانِ فوجِ ستم
علَم علَم تہہِ خنجر نفس کُشائی کا رنگ

علیہ السلام

رات دن ایک ساتھ تھے ہم تم

پھر بھی دن اور رات تھے ہم تم

کتنی چھوٹی سی اپنی دنیا تھی
جس کی کُل کائنات تھے ہم تم

یاد ہے وہ سُہانی رات تمھیں
دو تھے اور ایک ذات تھے ہم تم

خوبیوں خامیوں کا ذکر نہ تھا
ماورائے صفات تھے ہم تم
راستے تھے جدا جدا لیکن
ہر قدم ساتھ ساتھ تھے ہم تم

بے تعلق تھے کتنے دنیا سے
کتنا دنیا کے ساتھ تھے ہم تم

؏ السلام علیہ

دُکھ سے آزاد نہ کر رنج کے زندانی کو

منہ دِکھانا ہے ابھی گھر کی بیابانی کو

یاں خجل ہیں کہ کبھی اُس کے لیے کچھ نہ کیا
واں یہ بخشش کہ ترستے ہیں پشیمانی کو

اپنے خوابوں سے در و بام سجانے والے
داد دیتا ہوں تری بے سر و سامانی کو

اپنی صورت کے سِوا کوئی دکھائی نہ دیا
آئینہ ہو کے ترستے رہے حیرانی کو
دیکھ اے چشمِ فلک ! عہد اِسے کہتے ہیں
کھینچ لایا ہوں یہاں تک تری ویرانی کو

اُس کے سائے کو خدا سَر پہ سلامت رکھّے
دُھوپ سی چھاؤں سہی، ہے تو نگہبانی کو

کج کُلاہی کا سبب یہ ہے کہ گھر لوٹ کے ہم
اُس کے قدموں پہ جھکا دیتے ہیں پیشانی کو

ایک شعر

نشہ وہ ہے کہ کسی ہاؤ ہُو کے بس میں نہیں
مری خموشی تری گفتگو کے بس میں نہیں

علیہ السلام

شکستگی نے مِرا حوصلہ بحال کیا

جواب دے گئی ہمت تو پھر سوال کیا

سوال یہ ہے کہ جب زخم ہی نہیں بھرتے
تو پھر کسی نے یہاں کون سا کمال کیا

بتا کے آئی تھی جس رُخ سے، بے رُخی کی وہ لہر
وفا کو دل نے اُسی رُخ سے پائمال کیا

تھی دسترس میں جو شاخِ گلاب سوکھ گئی
جنونِ عشق نے ممکن کو بھی محال کیا
تھی انتہا پہ مری بے خودی کہ ایسے میں
تری نگاہ کی مستی نے بھی کمال کیا

تین شعر

خیال و خواب کے سینوں میں دل دھڑکتے ہیں
یہ دور وہ کہ مشینوں میں دل دھڑکتے ہیں

اب اُنگلیوں کی بصارت سے کام چلتا ہے
اب آئینے کی جبینوں میں دل دھڑکتے ہیں

تصوّرات کی گلیوں میں نبض چلتی ہے
تخیلات کے سینوں میں دل دھڑکتے ہیں

نہ یہ سبزہ، نہ یہ صحرا ہے میرا
تو پھر میں کون ہوں، اور کیا ہے میرا

مری آنکھیں اگر میری نہیں ہیں

تو پھر کس کا ہے، جو چہرہ ہے میرا

میں اِن ہاتھوں سے تجھ کو چُھو رہا ہوں
مگر یہ وہم ہوسکتا ہے میرا

تو کیا میں عالمِ تمثال میں ہوں
تو کیا یہ زندگی پردہ ہے میرا

خس و خاشاکِ سطحِ آب ہوں میں
مری منزل ہی کیا رستہ ہے میرا

بہت گہرا کوئی رشتہ ہے لیکن
تعلق تجھ سے آخر کیا ہے میرا

میں تیرے حال سے غافل نہیں ہوں
مری جاں دل بہت دُکھتا ہے میرا

میں اپنے منظروں میں چل رہا ہوں
یہ عالم دھوپ میں سایہ ہے میرا

سنو ! دیوار کے قدموں کی آہٹ
سخن ایجاد شیرازہ ہے میرا

سبھی چلتے رہیں گے ساتھ میرے
مگر یہ صرف اندازہ ہے میرا

اچانک یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے
وہی آنکھیں، وہی چہرہ ہے میرا

تغافل ہی سہی بارِدگر بھی
چلو کچھ تو خیال آیا ہے میرا

میں اپنی خلوتیں کیسے لٹا دوں
یہی لے دے کے سرمایہ ہے میرا

شبِ رفتہ سے صبحِ نَو کی جانب
جو کھُلتا ہے، وہ دروازہ ہے میرا

ستاروں نے صفِ ماتم اُلٹ دی
صبا نے رنج فرمایا ہے میرا

سرد مہری

یہ جو کھوئی ہوئی
بے مہر سی آنکھیں ہیں تری
یہ جو اُکھڑے ہوئے لہجے سے

بُجھڑے ہیں ترے لب
یہ جو برفیلی ہواؤں کا ہے چہرے پہ نقاب
غازہء لمس سے محروم یہ رخسار ترے
اور آویزوں سے بے فیض
یہ کانوں کی لَویں
لاکھ تو اَوڑھ لے
یخ بستہ نگاہوں کا حجاب
جل رہا ہے
کسی خوابیدہ سرائے میں چراغ

جس میں سیّال محبت کی تپش باقی ہے
تیرے اندر جو حرارت ہے
یہی کہتی ہے
''گل کرو شمعیں، بجھا دو مہ و مینا و ایاغ''
سعیِ ناکام رہی خواہشِ پردہ داری
سرد مہری نے تری مجھ کو دیا تیرا سراغ

بچت بازار

بچت بازار میں رونق ہی رونق تھی
سلیقے سے لگے تھے
اِک طرف اشیائے خوردونوش کے اسٹال

جہاں رکھی ہوئی تھیں

خوشی کے کھیت کی سوکھی ہوئی پھلیاں

دُکھوں کے باغ کے پھل

اُسی کے پاس

آٹے، دال، چاول

اور نمک کی بوریوں میں

بھوک اَرزاں نرخ پر

بکنے کو رکھی تھی

ذرا آگے

یقیں کے خوش گماں رستے سے ہٹ کر

کھلونے بِک رہے تھے

ابد کی ریل تھی

جو خوف کے ایندھن سے چلتی تھی

تمناؤں کے گھوڑے تھے

جو سرپٹ دوڑ سکتے تھے

قیامت کی گھڑی تھی

جس کی سوئی

ازل بج کر

ابد کے پاس ہی اٹکی ہوئی تھی

کہیں پر وقت کی بولی لگائی جا رہی تھی

کسی اسٹال پر سَر بند ڈبوں میں

عقیدت اَونے پونے دام بیچی جا رہی تھی

محبت کی مشینوں کے لگے تھے ڈھیر

اور انبار کے انبار رکھے تھے

فقط مشروط چاہت کے

کہ جن پر مہر تھی اُن کارخانوں کی

جو مجبوری کے ایندھن سے

چلائے جا رہے تھے

مذاہب بِک رہے تھے

سیاست بِک رہی تھی

شرافت بِک رہی تھی

محبت بِک رہی تھی

میں اُس کا ہاتھ تھامے

برسرِ بازار

کسی دیوار کی مانند چُپ تھا

مری آنکھیں

یقیں کے خوش گماں رستے سے ہٹ کر

بے یقینی کی دُکاں پر جم گئی تھیں

دُکاں پر جتنے گاہک تھے

یقیں کا وہم لینے آئے تھے

مجھے بھی وہم کی اندھی دُکاں سے

ایک پڑیا خواب لینا تھا

مگر

خوابوں کا سب اِسٹاک خالی تھا

نئے خوابوں کی قلّت تھی

نئے خوابوں کے سارے کارخانے

بند ہوتے جا رہے تھے

پُرانے خواب سے اُکتا چکا تھا میں

نئے خوابوں کی مجھ کو بھی ضرورت تھی
سو میں بھی لَوٹ آیا
نئے خوابوں کا دُکھ لے کر
بچت بازار سے میں لَوٹ آیا
نئے خوابوں کا سُکھ لے کر۔

چٹکی بھر سناٹا

شام کے اونچے کنگوروں سے

گِر کر چھَن سے ٹوٹ گئی
ایک پرانی یاد
ایک پُرانے زخم سے جھانکا
ایک مسیحا چپکے سے
چٹکی بھر سناٹا نکلا
شام کی خالی جیبوں سے

دیوالی

کہیں بھی روشنی ہو
جگمگاتی ہے

وہ گنگا کے کنارے ہو

کہ سندھو کے کنارے ہو

ستارہ سا کوئی چمکے

تو جگنو خواب گاہوں سے نکل کر

روشنی کا گیت گاتے ہیں

بنام مذہب و دین و دھرم

جتنے بھی جھگڑے ہیں

وہ جھوٹے ہیں

مگر یہ روشنی جو خواب کو رستہ دکھاتی ہے

یہی سچائی ہے

انسان کے اندر کی سچائی

مبارک ہو یہ ساعت روشنی کی

چلو اک دوسرے کا ہاتھ تھامیں

منائیں روشنی کا جشن

رقصاں ہوں

دلوں کی تال پر گائیں

مبارک ہو تمہیں بھی روشنی کا جشن

ہم کو بھی

وہ گنگا کے کنارے ہو

کہ سندھو کے کنارے ہو

کہیں بھی روشنی ہو جگمگاتی ہے

حُسنِ خرابات

آٹے سے بھرے ہاتھ یہ ماتھے پہ پسینہ

بکھرے ہوئے بالوں کا سمٹتا ہوا جُوڑا

ٹوٹی ہوئی پاؤں میں یہ دو رنگ کی جوتی

یہ آگ کی حدت میں پگھلتا ہوا سونا

میلے سے دوپٹے سے چھپایا ہوا سینہ
اور کانوں میں سونا چڑھے پانی کی یہ بالی
آنکھوں میں یہ ہلکی سی کسی خواب کی سرخی
اِس نرم کلائی میں یہ ٹوٹی ہوئی چوڑی
گدرائے ہوئے جسم سے لپٹا ہوا آنچل
یہ ہاتھ، یہ جُوڑا، یہ پگھلتا ہوا سَونا
ٹوٹی ہوئی پاؤں میں، یہ دو رنگ کی چپل
یہ میلا دوپٹا
اِن کا کوئی بوسے کے سوا مول نہیں ہے
اے حُسنِ خرابات ! ترا مول نہیں ہے

مگر وہ پاؤں کی ایک چپل

گھڑی کی ٹِک ٹِک
کہ جیسے ریل گاڑی کی رفتار کم ہوئی ہو
کہاں گئی ہے

یہ پاؤں کی ایک چپل
سڑک سے کچھ گاڑیاں گزرنے کی
آواز آرہی ہے
دکان شاید کوئی کھلی ہو
مگر یہ پاؤں کی ایک چپل
یہیں اتاری تھی لیکن
یہاں نہیں ہے
بچا کچھا ایک روٹی کا ٹکڑا
مری کتابوں میں کس نے رکھا
کہاں گئی ہے
یہ پاؤں کی ایک چپل
یہ گھر کی چابی زمین پر پڑی ہے
دکان شاید کوئی کھلی ہو
یہ میرے جوتوں کے فیتے سے
کھڑکی کا پٹ کس نے باندھا
یہ موم بتی

منڈیر پر رکھی تھی
یہاں نہیں ہے
کہاں گئی ہے
یہ پاؤں کی ایک چپل
یہ تیرے مخمور لہجے کی آدھی خوشبو
نہ جانے کب اور کیسے
توے سے گر کر
یہ سرد چولہے میں بجھ گئی ہے

یہ چٹخنی
میں نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کی تھی
کھُلی ہوئی ہے
کہاں گئی ہے یہ پاؤں کی ایک چپل
دکان شاید کوئی کھلی ہو
مگر یہ پاؤں کی ایک چپل !

پھر وہی رُوح کی بیتاب تمنا کا نزول

پھر وہی بولتی آنکھیں
وہی خاموش سے لب
پھر وہی زُلف سے بچھڑی ہوئی

رُخسار پہ لٹ

پھر وہی آگ لگاتی ہوئی

خوشبو تیری

پھر وہی آتشِ سیّال سے

بھیگا ہوا جسم

پھر وہی

رُوح کی بیتاب تمنا کا نزول

پھر وہی

سینۂ مرمر پہ دہکتے ہوئے پھول

اپنی تنہائی کے صحرا میں

چھپا لوں تجھ کو

آ مری جان

کہ سینے سے لگا لوں تجھ کو

یقیں دست و گریباں تھا گماں سے

(شیکسپیئر کے مشہور کھیل 'میکبتھ' کی ایک نظم "is this a dagger" سے ماخوذ)

یہ میرے سامنے کیا ہے۔
کوئی خنجر !

یہ خنجر جس کا دستہ

بڑھ رہا ہے میری جانب

مِرے ہاتھوں کی جانب

ٹھہر جا !

میں تِرے قبضے پہ اپنا

ہاتھ رکھ کر یہ یقیں کرلوں

کہ تُو کیا ہے

حقیقت ہے کہ اِک دھوکا ہے نظروں کا

بتا ! کیا تُو نہیں ہے

ایک مہلک سا تصوّر

تصوّر۔۔جس کو چھو کر دیکھنا ممکن نہیں ہے

بتا ! مجھ کو بتا

تُو ہے خیالِ خام، مہلک سا تصوّر

فتورِ ذہن یا پھر ذہن کی تمثیل

دماغی عارضہ کی بے وجودی

یا کوئی تصویر

مجھے لگتا ہے
تو سچ مچ وہی خنجر ہے
جو لہرا رہا ہے ہاتھ میں میرے
لیے جاتا ہے اُس جانب
مجھے اِس خنجرِ سفاک کی مانند
جدھر میں جا رہا تھا (جا رہا تھا۔؟)
جا رہا ہوں (جا رہا ہوں۔؟)
وار کرنے
یا کسی کو قتل کرنے
ہو بہو تیری طرح کے ایک خنجر سے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کہ جو میں دیکھتا ہوں
بس وہی سچ ہے
کہ محسوسات دھوکا دے رہے ہیں
میری آنکھوں کو
بناتے ہیں اِنہیں اُلّو!

مگر یہ کیا۔؟
مری آنکھیں
مری آنکھیں ٹپکتے دیکھتی ہیں خون کے قطرے
تری پیاسی زباں سے
ابھی کچھ دیر پہلے تک
یقیں دست و گریباں تھا گُماں سے
نہیں کچھ بھی نہیں ہے
فقط میرا جنوں ہے
تجھے جو خنجرِ خونخوار میں
ڈھالے ہوئے ہے
مگر، اب آدھی دنیا سو چکی ہے
کہ جیسے اب کوئی ذی روح
سوئے گا نہ جاگے گا
مکمل موت کی خاموش تاریکی میں
سوئی نیند سے
شیطانی خوابوں کی اذیت ناک سرگوشی

کہ جیسے اب

مُقدس رسمِ قربانی ادا کی جائے گی

کسی انساں کی شہ رگ

کاٹ کر اُس کا لہو

معبد میں دیوی دیوتاؤں کی قدم بوسی کرے گا

نگہباں (بھیڑیا۔۔ یعنی۔۔ کہ جس کی ہولناک

آواز کرتی ہے نگہبانی)

یہ کہتا ہے

کہ ہاں اب کاٹ دے شہ رگ

اُٹھا خنجر اُٹھا۔ چل۔ رُک نہیں۔ بڑھ

مگر تُو کون ہے

اے خنجرِ سفّاک۔

ٹھہر جا !

بتا مجھ کو بتا۔۔ تُو ہے خیالِ خام

مہلک سا تصوّر، فتورِ ذہن

یا پھر ذہن کی تمثیل

دماغی عارضہ کی بے وجودی
یا کوئی تصویر
بتا ! مجھ کو بتا
اے خنجرِ خونخوار
اے خنجرِ سفّاک۔

آنسو

وہی نیم روشن دریچے
شکستہ در و بام
وہ آنگن

وہ آنگن میں پیڑوں سے گر کر
بھٹکتے ہوئے زرد پتے
وہ شاخ بُریدہ
وہ مٹی کا تسلا
وہ تسلے میں بکھرے
چنے، باجرے اور چاول کے دانے
وہ کمرا
وہ بے رنگ دیوار
بچوں کی تختی
لکیریں
وہ آڑی وہ ترچھی لکیریں
وہ بستر
وہ بوسیدہ چادر
وہ میلے کچیلے سے پردے
ترے سرخ آنچل میں
لپٹی ہوئی تیرگی بھی

مرے دست و بازو سے

چمٹی ہوئی بے بسی بھی

سبھی کچھ ہے رختِ سفر میں

مگر ایک آنسو

مگر ایک بوسہ

جو حق تھا ہمارا

سفر کا ستارا

کہیں بھی نہیں ہے

وجودِ نامعلوم

(ماخوذ : بادل سرکار)

فاصلوں سے کوسوں دور

اپنے آپ سے آگے

اپنی ذات سے آگے

دوسری طرف یعنی

دوسری طرف جا کر

اور آگے جاؤں گا

اور آگے جانے تک

آنکھ بند رکھوں گا

اور بند آنکھوں سے

دیکھ لوں گا چپکے سے

اپنی ذاتِ نادیدہ

اِک وجودِ نامعلوم !

دیارِ بے وجود و غیر آشنا

(ماخوذ : بادل سرکار)

میں اپنے آپ کی تلاش میں

بہوں گا موجِ تیز تر کے ساتھ ساتھ

رُکاوٹوں کو اپنے پاؤں سے دھکیلتا ہوا

خود اپنی قوتِ نمو سے کھیلتا ہوا
مرے وجود پہ جو قرض ہے
اُسے ادا کیے بغیر
دیارِ بے وجود و غیر آشنا کی سَمت جاؤں گا
بس ایک دِن
چلوں گا رات دِن
دیارِ بے وجود و غیر آشنا کی سَمت جاؤں گا
کہ جس کی کوئی حد نہیں
تری بھی کوئی حد نہیں
مری بھی کوئی حد نہیں !

بھنور کے نیچے ہے ایک کھائی

بھنور کے نیچے ہے ایک کھائی
اور ایک کھائی ہے

اُس کے نیچے
اور ایک کھائی ہے
اُس کے نیچے
کہ جس میں آباد ہے
ایک شہرِ خموشاں
کہ جس میں ہیں محوِ استراحت
ہزار صدیوں کے سب زمانے
ہزار صدیوں کے
سب زمانوں کے سب زمانے
ہزار صدیوں کے
سب زمانوں کے سب زمانوں کے نیچے ہے
ایک کھائی
اور ایک کھائی ہے
اُس کے نیچے
اور ایک کھائی ہے
اُس کے نیچے

کمزور سسکتا سا وجود

خلعت و منصب و جاگیر و قبا و دستار

اُس کے جوتوں پہ جمی گرد کے آگے ہیں غُبار
فلسفہ ہائے وجود و غمِ تقدیر و عدم
زینتِ مکتب و موضوعِ مقالاتِ حشم
اور وہ لاغر و کمزور سسکتا سا وجود
بے نیازِ خلشِ عیش و غمِ نام و نمود
عہدِ ناپُرساں کی تاریخ رقم کرتا ہے
اپنے بچوں کے لیے رزق بہم کرتا ہے

نیو ورلڈ آرڈر

میرے بچوں کے فیڈر میں
پانی کی مقدار بڑھتی چلی جا رہی ہے

ننھے منے سے خوش رنگ
بستوں میں رکھی ہوئی سب کتابیں
ناشروں اور اہلِ سیاست کے
محلوں کا قالین بن کر
اپنے دانش وروں کے قدم چومتی ہیں
منہ اندھیرے نکلتے سویروں کے
ماتھے پہ ممتا کا بوسہ
بھوکے پیاسے مگر
علم کی راہ پر گامزن
جگنوؤں کے لیے
رزق ہے روشنی کا
اور اِس روشنی میں نہاتے ہوئے
اہلِ تہذیب و دانش مدعی ہیں
کہ اُن کے قلم نے
ہانپتے کانپتے سچ کو زندہ رکھا ہے !
تیرگی میں اُجالا رکھا ہے

مسلکِ زر سے چمٹے ہوئے

مغربی ناخداؤں نے اِک بار پھر

اہلِ مشرق پہ قدغن لگا دی

نقشہ ہائے طلوع و غروبِ مہ و آفتاب

از سرِ نو بنائے گئے ہیں

اور منادی کرا دی گئی ہے

کوئی آواز ایسی نہ آئے

جس سے ایوان ہائے معیشت میں بیٹھے ہوئے

عالمی سود خوروں کی نظریں

میرے بچوں کے فیڈر پہ مرکوز ہو جائیں

اور قبروں کی مٹی سے گوندھے ہوئے

اِن بتوں کو خدا یاد آئے

میرے عالی نسب اہلِ دانش

اہلِ مغرب کی تھوکی ہوئی آگہی سے

اپنی اپنی دکانوں پہ بیٹھے ہوئے

روشنی بیچنے میں مگن ہیں
اور دو چار غارت گرِ دین و دنیا
سرگراں پھر رہے ہیں
بے اماں پھر رہے ہیں

خواب آتے ہیں مسیحائی کو

خواب آتے ہیں مسیحائی کو
اور ہمیشہ کی طرح

آج بھی آئے ہیں
زخموں کی مسیحائی کو
پا شکستہ ہی سہی شہرِ تمنا لیکن
سر بُریدہ تو نہیں
وقت ملبے کی طرح
بے حس و حرکت ہی سہی
خواب کی ڈور سے ٹُوٹا ہے
نہ ٹُوٹے گا کبھی
شہرِ مدفون سے
آہستہ دبے پاؤں نکل آتی ہے
زندگی خواب کی تعبیر لیے
خواب آتے ہیں مسیحائی کو
آج کی بات نہیں
اِس سے پہلے بھی کئی بار گری
شہرِ تمنا کی فصیل
سانس کا قحط پڑا

لوگ نایاب ہوئے

خواب، بے خواب ہوئے

اور بے خواب زمینوں سے اُگے

پھر اُسی شہرِ تمنا کے شجر

جس کی شاخوں سے اُلجھتے ہی رہے

گردشِ وقت کے بے رحم بھنور

خواب وہ مرہمِ نایاب ہے

جس کو مل جائے

اُس کے ہر زخم کا

ہر چاک اچانک سِل جائے

خواب آئے ہیں مسیحائی کو

لاؤ یہ زخم دکھاؤ

اپنی پلکیں تو اُٹھاؤ

تھوڑی ہمت تو کرو

تھوڑی کوشش تو کرو

دیکھو یہ شہرِ تمنا ہے

یہاں موت نہیں آ سکتی

دیکھو یہ خوابِ تمنا ہے

اِسے دیکھو تو

اِک نظر اِس کی طرف

دیکھو تو

اِک نظر میری طرف

دیکھو تو !

رنگ رنگ تصور کی مینا کاری

گزر گیا یہ برس

اور اب یہ سوچتے ہیں

کہ ہم نے گلشنِ صد خواب کی کیاری میں

جو بیج بوئے تھے

وہ بارور ہوئے کہ نہیں

جو رنگ رنگ تصوّر کی مینا کاری تھی

وہ معتبر پسِ عہد وفا ہوئی کہ نہیں

نگار خانہء صد کوچہء ثقافت میں

ندائے رومی وسعدی سنی گئی کہ نہیں

نوائے حافظِ شیراز کے ترنم سے

دلوں کی تال پہ رقصِ جنوں ہوا کہ نہیں

فضا میں رقص کناں تھے جو صادقین کے رنگ

وہ رنگ سانچہء تصویر میں ڈھلے کہ نہیں

نگاہِ فیض، شکستہ دلی کے چہرے پر

برائے کارِ مسیحائی بھی پڑی کہ نہیں

ہوائے کوچہء جاناں کی نرم چھاؤں میں

ہمارے عہد کے رسّام کھُل گئے کہ نہیں

ردائے سایۂ تمثیل اپنے چہرے پر

ہزار قصّۂ دوراں سجا سکی کہ نہیں

گزر گیا یہ برس اور اب یہ سوچتے ہیں

کہ اب جو صبحِ محبت طلوع ہونی ہے

تو اُس کے گلشنِ صد خواب کی کیاری میں

لگائی جائیں گی

کچھ اور رنگ کی بیلیں

کِھلائے جائیں گے

کچھ اور رنگ رنگ کے پھول

کہ اپنے پاس

فقط خواب ہیں

اور

آنکھیں ہیں !

آدمی کی تنہائی اک نیا سویرا ہے

آدمی کہاں جائے

روز و شب کے ہنگامے

راستہ نہیں ملتا

آدمی کے اندر کا

راستہ نہیں کُھلتا

ساز اور سُروں کے بیچ

بات کرنے لگتی ہے

آدمی کی تنہائی

ساز سے اُبھرتی ہے

آدمی کی تنہائی

آدمی اُبھرتا ہے

آدمی کے اندر سے

اپنی بات کہنے کو

آدمی کہاں جائے

اپنی بات کہنے کو

آدمی ترستا ہے

لفظ کے خلاؤں میں

کوبکو بھٹکتا ہے

لفظ سے زیادہ ہے

آدمی کی تنہائی

روز اِک نئی تمثیل چاہتی ہے تنہائی

راگ کے سُروں میں ہے

آدمی کی تنہائی

اور ایسے عالم میں

آدمی کہاں جائے

شہر میں معیشت کے

جتنے کارخانے ہیں

اُن میں کام آتی ہے

آدمی کی تنہائی

آہنی مشینوں سے

ڈھل کے جب نکلتی ہے

آدمی کی تنہائی دُور کرنے لگتی ہے

آدمی کی تنہائی

پھر بھی آدمی تنہا

کون اُس طرف دیکھے

اُس طرف ہے ہنگامہ

بے بسی کا ہنگامہ

بے حسی کا ہنگامہ

آگہی کا ہنگامہ

اُنگلیوں کی جنبش سے

ساز میں اُترتی ہے

آدمی کی تنہائی

آؤ !

اِس طرف دیکھیں

اِس طرف ہے تنہائی

نازِ صد مسیحائی

راگ کے سُروں میں ہے

آدمی کی تنہائی

کون اُس طرف دیکھے

اُس طرف اندھیرا ہے

آدمی کی تنہائی

اِک نیا سویرا ہے

نئے سال کی پہلی شب تھی

نئے سال کی پہلی شب تھی
وہ محفل عجب تھی
سبھی اجنبی تھے

مگر ایسے آپس میں گھُل مِل گئے تھے

کہ جیسے ہمیشہ سے ہو آشنائی

کوئی لڑکھڑاتا

تو کوئی ستارہ بھری آنکھ

مستی کے عالم میں اُٹھتی

تو دل بیٹھ جاتے

سنبھلنے کی کوشش میں گلدان گرتے

کہ پیمانے آپس میں ٹکرا کے آواز کرتے

تو ایسے میں خوشبو بھری

اجنبی آشنا سانس کے لمس کی دھڑکنوں سے

دھڑکتے دلوں کی تھرکتی نگاہیں

کسی نیم تاریک گوشے کی جانب بھی اُٹھتیں

جہاں آشنائی کی لَے پر

کوئی اجنبی دُھن

کسی اجنبی راگ سے

خواب کے لمس کو

اپنے ہونٹوں سے چھونے کی کوشش میں

مصروف ہوتی

مگر اب بہت دن ہوئے

یاد بھی تو نہیں آ رہا ٹھیک سے

اک نگاہِ خرابات

میری بھی جانب اُٹھی تھی

اُٹھی تھی؟

اُٹھی تھی، یقیناً اُٹھی تھی

میں اب اُس کی صورت سے نا آشنا ہوں

مگر اُس نے

اُس رات۔ یعنی

نئے سال کی پہلی شب میں

کسی نیم تاریک گوشے سے

آواز دی تھی مجھے بھی

تو میں نے بھی شاید۔۔

مگر خیر۔۔۔

قصّہ یہی تھا
نئے سال کی پہلی شب تھی
وہ محفل عجب تھی
سبھی اجنبی تھے
مگر ایسے آپس میں گھُل مِل گئے تھے
کہ جیسے ہمیشہ سے ہو آشنائی

میرا سوچا ہوا

میرا سوچا ہوا
میرا لکھا ہوا
میرا بولا ہوا

لوگ سنتے رہے

اور روتے رہے

اور پھر کیا ہوا

دوسری صبح

حسبِ معمول پھر

زخم تنہائی کے تخم بوتے رہے

میں نے خلوت سے آگے

کہیں دور جا کر بسائی تھی

خوابوں کی تنہائی میں

ایک بستی

اور

خوابوں کی تنہائی میں

ایک بستی کا عالم یہ تھا

لوگ تعبیر کے

خواب اَوڑھے سوتے رہے

میں نے ایک ایک موتی چُنا خواب کا

اور خوابوں سے

اِن موتیوں کو سنبھالے رکھا

پھر ہوا اِک بہانہ بنی

اور قذاق اِن موتیوں کو

پِروتے رہے

اُس نے کاغذ دیا

اور قلم بھی دیا

حوصلہ بھی دیا

اور مجھ سے کہا

جاؤ خلوت میں

جاؤ صبا

اور پھر یوں ہوا

جام پر جام آتے رہے

اور پھر یوں ہوا

شعر پر شعر ہوتے رہے

دُوئی کا نغمہ الست

(ماخوذ : بادل سرکار)

مہیب اور سیاہ رات تھی

سیاہ رات کی قبا کے چاک سے

میں گھورتا رہا

کسی کو ڈھونڈتا رہا

ستارے میری ذات میں اُتر کے

مجھ کو گھورتے رہے

کسی کو ڈھونڈتے رہے

مجھے لگا

کہ جیسے میں نے دیکھ لی

اُس آگ کی جھلک

جو میری ذات میں

چھپی ہوئی تھی اب تلک

اُس آگ سے

اُس آگ کے وجود سے

نکل رہی تھی کوئی شے

چمک رہی تھی کوئی شے

کہ جس کی دھار تیز تھی

وہ تیز دھار چیز اور وہ چمک

نہ جانے کیا تھی

آگ تھی کہ روشنی

وجودِ خواب تھا کہ خواب تھا

کسک تھی یا کوئی خلش

میں جس کا منتظر ہوں

محبت آج تک چپ ہے

مگر وہ لازمانی تھی

امکان کا قیدی

ڈوبتی نبضوں سے خائف ہے

سراغِ زندگی

میں جس کا منتظر ہوں

میں جس کا منتظر ہوں

کاش وہ آ کر

مری آنکھوں کو

پھر سے روشنی دے دے

یہ مدّت سے یونہی بے جان ہیں

خوابوں کے مدفن میں

اِنہیں پھر سے دکھائی دے

مری تنہائی کا صحرا

درونِ ذات پھیلا ہے

یہ دل کب سے اکیلا ہے

فقط اُس کی کمی ہے

سوگ میں ڈوبا ہوا ہے دل

چلی آئے مری جانب

مری بے نور آنکھیں

منتظر ہیں روشنی کی

اُسی کی منتظر ہیں

چلی آئے

مری بانہیں

معانی بھول جائیں گی حصاروں کے

چلی آئے

نہ جانے کون سی مشکل نے

اُس کو روک رکھا ہے

چلی آئے

کہ اُس کے لوٹ آنے سے

مری اِن ڈوبتی نبضوں میں شاید

زندگی پھر سے اُبھر آئے

میں پھر سے جی اُٹھوں

اور

خواب کے مدفن میں

سوئی میری آنکھیں

دیکھ لیں اُس کو

جسے میں نے

فقط اک بار دیکھا تھا

محبت آج تک چپ ہے

وہ لیلیٰ ءِ سخن تھی
جانِ محفل تھی چلی آئے

چلی آئے

بھٹکتی ہے نجانے

کس کے خوابوں اور خیالوں میں

چلی آئے

پلٹ آئے

میری شامیں ادھوری ہیں

مری راتیں نہیں کٹتیں

مری آنکھیں سوالی ہیں

یہ آنکھیں آج تک چپ ہیں

محبت آج تک چُپ ہے

مگر وہ لازمانی تھی

زُلیخا سے کوئی کہہ دے

کہ اُس کی شاعری بیتاب ہے

میری نگاہوں میں

وہ اپنی شاعری لے جائے

کئی غزلیں، کئی نظمیں

جنہیں وہ بے خیالی میں

مری آنکھوں میں رکھ کر

بھول آئی تھی

ابھی تک گنگناتی ہیں

مری پلکوں کے سائے میں

مری پلکوں کے سائے سے

وہ اپنی شاعری لے جائے

انانا کی سہیلی تھی

اُسے عشتار نے بہکا دیا ہوگا

مجھے پورا یقیں ہے

اُسے دجلہ میں دھکا دے دیا ہوگا

مگر وہ لازمانی تھی

محبت کی نشانی تھی

امکاں کا قیدی

مسافر آج تک چُپ ہے
کہ اُس کے ہاتھ پہ
اُس لازمانی نے

انا نا کی سہیلی نے

محبت کی نشانی نے

جو اِک دن

بے خودی میں ہاتھ رکھا تھا

بہت دھیرے سے

خوابوں اور خیالوں میں

یہ میرا ہاتھ تھاما تھا

پھر اِن ہاتھوں کو سینے سے لگایا تھا

اِنہیں چوما تھا

اپنا دکھ بتایا تھا

مسافر ہاتھ چُپ ہیں

آج تک چُپ ہیں

مسافر ہونٹ پر

قدغن لگی ہے

محبت زہر کا امرت لیے

چُپ چاپ

سانسوں میں اُترتی جارہی ہے
کہ اُس کا شاعرِ بے مثل و بے مایا
فقط اک خواب کے زنداں کا قیدی ہے
یقیں کا خوش گماں ہے
اور
کسی امکاں کا قیدی ہے

ڈوبتی نبضوں سے خائف ہوں

سنو !
میں نے سنا ہے

اپنے کانوں سے سنا ہے

کہ اِک دن خامشی کی باگ تھامے

وہ اپنے خواب کے قدموں میں

بیٹھی کہہ رہی تھی

کہ صدیوں کی مسافت نے

میرے پیروں سے باندھے ہیں

تھکن سے چور اِک اُمید کے گھنگرو

میں اپنی ڈوبتی نبضوں سے خائف ہوں

نہ جانے کب، کہاں

یہ زندگی کی ڈور کٹ جائے

میں اپنے اور تمھارے بیچ کے

اِن فاصلوں کو

چند سانسوں کی کمی سے

ہار نہ جاؤں

بساطِ عمر پہ پھیلے ہوئے

بے نام رستوں میں

کہیں ایسا نہ ہو اِک دن
یونہی چپ چاپ مر جاؤں

سراغ زندگی

مرے کانوں میں
یہ آواز بھی آئی تھی

اُس دن

کہ اے امکان کے قیدی

یقیں کے خوش گماں

اے شاعرِ بے مثل و بے مایا

طلسمِ عشق سے اب تک نہیں نکلی

وہی لڑکی

کہ جس کو تُو نے

اپنے خواب میں

اِک بار دیکھا تھا

پسِ دیوار دیکھا تھا

وہی دریائے الفاظ و معانی

وہی لڑکی

طلسمِ عشق سے اب تک نہیں نکلی

وہی لڑکی

جسے وہ نیل کا ساحل

وہ دجلہ کا کنارہ

وہ تہذیبوں کا گہوارہ

وہ بحرِ روم کی موجیں

وہ ایتھنز اور اسپارٹا کی گلیاں

موہن جوڈارو اور ہڑپہ کے کوچے

وہ گنگا اور جمنا کی حسیں وادی

ہمالہ سے نکلتی

اور بل کھاتی ہوئی ندّی

ہواؤں میں معلّق

باغ کی سرسبز حیرانی

مہر گڑھ کے بیاباں

اُسی کو ڈھونڈتے تھے

اُسی کو ڈھونڈتے ہیں

اُسی لڑکی کو

جو اَب تک نہیں نکلی

طلسمِ عشق سے تیرے

اُسی لڑکی کے آنچل میں

پناہیں ڈھونڈتے تھے
پناہیں ڈھونڈتے ہیں
مگر اے شاعرِ بے مثل و بے مایا
سراغِ زندگی تو نے ابھی شاید نہیں پایا
سراغِ زندگی،
میں نے ابھی شاید نہیں پایا !

ادھورا کام

بچھڑ کے تم جو ملتے تھے

تو یوں محسوس ہوتا تھا

کہ جیسے مرگ کے

دُھندلے کناروں تک

پہنچتے ہی

ادھورا کام کوئی

زندگی کو یاد آ جائے

ہونے کی یلغار

دریا کے اُس پار پہنچ کر

میں نے دیکھا پیچھے مُڑ کر
پانی کے اِک فرش پہ میرے
پاؤں جمے تھے
اُونچے نیچے پتھر کا
اِک زینہ تھا
اور جنگل تھا
اور جھاڑی تھی
اور تپتی دھوپ میں سایہ تھا
آڑے ترچھے رستے تھے
اور میں اپنے آپ سے بچھڑے
اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا تھا
اُن رستوں میں
جن رستوں سے
میں گزرا تھا
پہنچا تھا میں
دریا کے اُس پار

دریا کے اُس پار تھی

میرے ہونے کی چہکار

میرے ہونے کی یلغار

تھوڑی سی امید

(ترجمہ : گگن گل)

صرف تھوڑی سی اُمید

جیسے سورج کی کرن

ایک موہوم کرن

ذائقہ،

جیسے کسی بھیگے ہوئے پتھر کا

جیسے کیچڑ میں تڑپتی ہوئی

مچھلی میں ہو سانس

صرف اِتنی سی اُمید

صرف تھوڑی سی اُمید

جیسے اٹکا ہو گلے میں

کوئی بھُولا ہوا گیت

جیسے سینے میں

کوئی آہ دبی رہ جائے

جیسے چیونٹی

کسی دیوار سے شیشے کی

پھسلتے ہوئے رک جائے کہیں

جیسے دریا کی تہوں میں ہو

چھپی پیاس کوئی

صرف تھوڑی سی اُمید

صرف اتنی سی اُمید

کتابیں آئینہ خانہ

کتابیں آئینہ خانہ

کہ ان میں حال، ماضی

اور

مستقبل کا عکسِ بے کراں محفوظ رہتا ہے

قلم کی حرمت وتوقیر کی

سچی گواہی دینے والی اِن کتابوں کو

فنا کرنے کی ساری کوششیں

بے سود رہتی ہیں

ہلاکو ہوں کہ اپنے وقت کے چنگیز

ڈرتے ہیں کتابوں سے

یہ بوسیدہ کتابیں

کھینچتی ہیں

سانس کی ڈوری خرابوں سے

علیہ السلام

مدتوں بعد اُس کو خط لکھا

اور وہ بھی غلط سلط لکھا

کبھی قصداً غلط، درست پڑھا
کبھی دانستہ بھی غلط لکھا

جانے کس خال و خط کے ہاتھ لگا
جانے کس کے پتے پہ خط لکھا

ٹھیک کو ٹھیک ہی لکھا ہم نے
جو غلط تھا اُسے غلط لکھا

☆☆☆

میراث کسی اور ہی جاگیر کی نکلی

غالبؔ کی سمجھتے تھے، غزل میرؔ کی نکلی

نکلی نہ مرے دل سے کبھی تیری تمنا
حسرت نہ کبھی نالۂ دل گیر کی نکلی

کڑیاں تھیں سبھی ایک ہی زنجیر کی لیکن
بس ایک کڑی دوسری زنجیر کی نکلی

کیا تجھ سے شکایت کہ یہ دنیا ہی مری جاں
دلدادہ اُسی مسندِ جاگیر کی نکلی

علیہ السلام

نہیں ہوں گی ملاقاتیں نہ ہوں گی
اشاروں میں بھی اب باتیں نہ ہوں گی

نہیں لکھیں گے اب ہم دل کی باتیں
غزل ہوگی، یہ سوغاتیں نہ ہوں گی

گزر جایا کریں گے منہ چھُپا کر
تری یادوں سے بھی باتیں نہ ہوں گی

رہے گا دل کا موسم ابر آلود
گھٹا اُمڈے گی، برساتیں نہ ہوں گی

نہیں گزریں گی شامیں میکدوں میں
بسر سڑکوں پہ اب راتیں نہ ہوں گی

مری جاں قصۂ پارینۂ جاں

نئی رت کی مداراتیں نہ ہوں گی

بہت دکھ تھا تمہیں رسوائیوں کا
چلو اب یہ ملاقاتیں نہ ہوں گی

نہیں آئیں گے اب آنکھوں میں آنسو
پریشاں اب تری راتیں نہ ہوں گی

علیہ السلام

منزلیں نہیں دیکھیں، راستہ نہیں دیکھا

چل پڑے تو پھر ہم نے جا بجا نہیں دیکھا

میری دیکھا دیکھی سب، دیکھنے لگے اُس کو
قربتیں نہیں دیکھیں، فاصلہ نہیں دیکھا

جیسا آپ کہتے ہیں، ویسا مان لیتے ہیں
آپ کے بھروسے پر آئینہ نہیں دیکھا

جانے کس کو دیکھا تھا، جانے کس کو سوچا تھا
آپ کو نہیں دیکھا، آپ سا نہیں دیکھا

علیہ السلام

بے نام راستوں پہ نہ جا ، اب بھی لوٹ آ
''لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو'' تو کیا، اب بھی لوٹ آ

اب بھی کسی کے دل میں تڑپ ہے ترے لیے
آجا، کسی کا دل نہ دُکھا، اب بھی لوٹ آ

اے اگلی منزلوں کے مسافر پلٹ کے دیکھ
بگڑا نہیں ہے کچھ بھی ترا، اب بھی لوٹ آ

اگلے قدم پہ موڑ ہے دشتِ جدائی کا
دامِ وفا ہے، دامِ وفا، اب بھی لوٹ آ
صحرائے آرزو سے نکل آ، سراب ہے
دھوکا نہ کھا، فریب نہ کھا، اب بھی لوٹ آ

یہ جو خلش ہے، زادِ سفر ہے، اِسے سنبھال
زاد سفر کو یوں نہ لُٹا اب بھی لوٹ آ

منزل کی ہے خبر نہ تجھے راستے کی ہے
کیا ہوگیا ہے تجھ کو صبا ، اب بھی لوٹ آ

ایک شعر

خزاں تُو نے بھی جھیلی تھی، خزاں میں نے بھی جھیلی ہے
ترے چہرے پہ رونق ہے، مرے چہرے پہ ویرانی

علیہ السلام

پری چہروں کے چکّر میں نہ پڑیئے
بس اپنی دُھن میں رہیے اور لکھیے

طلسمِ حسن ہے، کچھ بھی نہیں ہے
بس اپنی آنکھ کو اب کھول رکھیے

اذیّت جھیل لیجے بے رُخی کی
محبت کی پشیمانی سے بچیے

بہت مشکل سے میں نکلا ہوں آگے
خدارا ! اب مرے پیچھے نہ پڑیئے
ہوس کے خواب سے آگے نکل کر
جنوں کی حشر سامانی سے بچیے

لکھی جائے گی جو آئندگاں میں
غزل وہ بھی سنا دیتے ہیں، چلیے

کسی بھی رنگ سے باہر نکل کر
کوئی بھی رنگ ہو خاکے میں بھریئے

ایک شعر

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
ہم تہی دست بھرے بیٹھے ہیں

علیہ السلام

کیا بتلائیں عشق میں اُس کے، وقت کی جو اوقات ہوئی
صبح سے پہلے دن نکلا اور شام سے پہلے رات ہوئی

اِتنی گہری خاموشی اور اِتنا گہرا سنّاٹا
کچھ تو کہیے آخر ہم سے، ایسی بھی کیا بات ہوئی

لفظوں کی دہلیز پہ اُس نے اپنی آنکھیں رکھ دی ہیں
پہلی بار سخن کو اپنے، خاموشی سے مات ہوئی

اوّل اوّل جیت رہے تھے ہم بھی جانے کس کا دل
آخر آخر دل کی بازی جانے کیسے مات ہوئی
کوئی تو ہوگا جس کے غم میں آنکھ ہماری بھر آئی
کوئی تو ایسا ہوگا جس کی خاطر یہ برسات ہوئی

نقلِ مکانی آنکھ سے دل تک اتنی بھی آسان نہ تھی
لیکن جب آسان ہوئی تو کیسی راتوں رات ہوئی

دو شعر

صاف لگتا ہے کہ تحریر کسی اور کی ہے
تُو کوئی اور ہے، تصویر کسی اور کی ہے

نفسِ مضموں تو وہی ہے، جو ہمیشہ تھا، مگر
لہجہ کہتا ہے کہ تقریر کسی اور کی ہے

علیہ السلام

اب کوئی آرزو کریں گے نہیں
ہم تری جستجو کریں گے نہیں

فیصلہ کرلیا خموشی سے
اب کوئی گفتگو کریں گے نہیں

ہم پیالہ نہ ہوگی یاد تری
دل شریکِ سُبو کریں گے نہیں

تہمتِ بے حِسی اُٹھالیں گے
چاکِ داماں رَفو کریں گے نہیں

دل میں رکھیں گے، اپنے دل کی بات
بات دل کی کبھُو کریں گے نہیں

تجھ کو رکھیں گے ہم شریکِ سخن

تجھ سے پر گفتگو کریں گے نہیں

رنگ دیکھیں گے تیری محفل کا
دل کو اپنے لہو کریں گے نہیں

تیری باتوں کا اعتبار اے دل
کر چکے، اب کبھُو کریں گے نہیں

؟ السلام علیہ

نہیں ہے کیا کوئی اس دل میں، اے دل
یہ تنہائی تری محفل میں اے دل

محبت ناقۂ بے ساربان ہے
دلِ لیلیٰ نہیں محمل میں اے دل

نہ جانے کس طرف ہم جا رہے تھے
نکل آئے تری محفل میں اے دل

غبار کارواں ہو کر بکھر جا
رکھا ہے کیا کسی منزل میں اے دل

لگا رہتا ہے کس کی جستجو میں
پڑا رہتا ہے کس مشکل میں اے دل

رہنے دیجے ہمیں، سرکار نہیں چاہیے ہے
پھول درکار ہیں، تلوار نہیں چاہیے ہے

یہ کُھلا صحن، یہ سایہ، یہ رمِ بادِ صبا
اِس چمن میں کوئی دیوار نہیں چاہیے ہے

عزتِ نفس کا سودا ہمیں منظور نہیں
مسند و جبّہ و دستار نہیں چاہیے ہے

ہم وہ درویش سخن گو کہ فضیلت کے لیے
آپ سے خلعت و دستار نہیں چاہیے ہے

غمگساری کے لیے شرط ہے نذرانۂ جاں
یار اغیار کی بھرمار نہیں چاہیے ہے

اُٹھ چکا پردۂ تمثیلِ وفاداریٔ شب

اب ہمیں کوئی بھی کردار نہیں چاہیے ہے

جنسِ بے مایہ سہی، دل کے خریدار بہت
آپ کی چشمِ فُسوں کار نہیں چاہیے ہے

ہے جو درکار تو درکار، زلیخا کا جنوں
حُسنِ یوسف کو خریدار نہیں چاہیے ہے

علیہ السلام

سکھ چین بہت ہے ہم کو یہاں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے
جا اپنی گلی میں کھیل میاں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

جیسی بھی ہے اپنی چوکھٹ ہے، جیسا بھی ہے اپنا آنگن ہے
ہَوں رقص کناں یا گریہ کناں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

کوچے میں ترے ہنگامہ سہی، گلیوں میں مری سناٹا سہی
گلیوں میں تری وہ بات کہاں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

کیا سود و زیاں سے ہم کو غرض، سودا ہے ہمیں، سودائی ہیں
تُو اپنی گلی میں میں کھول دکاں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

بے تاب نہ ہو اِک روز کبھی، نکلیں گے گلی میں تیری بھی
کرنے ہیں ابھی کچھ کام یہاں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

کچھ رنگ ابھی ہیں رُوپ طلب، کچھ رُوپ ابھی ہیں رنگ طلب
کچھ خواب ابھی ہیں خوابِ گراں، ہمیں اپنی گلی میں رہنے دے

تین شعر

لکھا ہوا ہے مقدر میں جب نہیں ملنا
یہ طے ہوا ہے کہ چھپ کر بھی اب نہیں ملنا

یہ قید بھی ہے کہ رہنا ہے رات دن اک ساتھ
یہ شرط بھی ہے کہ اب روز و شب نہیں ملنا

یہ اختیار بھی اب اُس کے پاس ہے کہ ہمیں
کب اُس سے ملنا ہے اور اُس سے کب نہیں ملنا

ہے جس طرف نگاہ، صدف اُس طرف نہیں
ناوَک کا رُخ جدھر ہے، ہدَف اُس طرف نہیں

ہاں ہاں وہ دشمنوں کی صفوں میں سہی مگر
میری طرف ہے، میری طرف، اُس طرف نہیں

میں جس طرف ہوں، سارا زمانہ ہے اُس طرف
تُو جس طرف ہے تیغ بکف، اُس طرف نہیں

جتنے ہیں ذی وقار و شرف، میرے ساتھ ہیں
کوئی بھی ذی وقار و شرف، اُس طرف نہیں

آب حیاتِ علم اِدھر ہے، اِدھر تو دیکھ
جس رُخ پہ تُو کھڑا ہے، نجف اس طرف نہیں

علیہ السلام

خاطر تو ہوئی، دل کی مدارات ہوئی تو
آغاز ہوا، پھر سے شروعات ہوئی تو

جیسے بھی جمی، جم تو گئی کھیل کی بازی
جیسے بھی ہوئی، اُن سے ملاقات ہوئی تو

رستہ تو نکل آیا کوئی بند گلی سے
خوابوں کے دریچے سے کرامات ہوئی تو

مطلع نہ ہوا صاف، مگر حبس تو ٹوٹا
کھل کر نہ سہی، تھوڑی سی برسات ہوئی تو

سورج تو نمودار ہوا، برف تو پگھلی
صد شکر کہ تبدیلیٔ حالات ہوئی تو

سب ہار گئے، دل نے مگر جیت لی بازی
کیا ہوگیا ایسے میں اگر مات ہوئی تو

کچھ تلخیٔ دوراں کے بھی قصّے نکل آئے

شکوے ہی سہی، اُن سے مگر بات ہوئی تو

دو شعر

بند گلی سے نکلا ہے
یہ جو خواب کا رستہ ہے

کاٹھ کباڑ میں یادوں کے
دل بھی شاید رکھا ہے

مسلسل ایک ہی جانب سفر اچھا نہیں لگتا
کوئی بھی راستہ ہو، عمر بھر اچھا نہیں لگتا

وہی دل ہے، کبھی جو چارہ گر کے ناز اُٹھاتا تھا
وہی دل ہے، جسے اب چارہ گر اچھا نہیں

بُرا لگتا ہے، جو لگتا ہے دل کو ایک بار اچھا
کوئی اچھا مجھے بارِ دگر اچھا نہیں لگتا

وہ منزل ہے، کہ یہ تنہائی بھی کھلتی ہے خلوت کو
سفر وہ ہے، کہ کوئی ہم سفر اچھا نہیں لگتا

در و دیوار سے گھر کے بڑی وحشت سی ہوتی ہے
نہیں ہوتی ہے یہ وحشت، تو گھر اچھا نہیں لگتا

وہ ہاتھ اچھا نہیں لگتا، جو مظلوموں پہ اٹھتا ہے
جو درباروں میں جھکتا ہے، وہ سر اچھا نہیں لگتا

خفا ہوتا تو کیوں ہوتا، اگر میں خوش نہ تھا اس سے

بُرا کیوں مانتا میں، وہ اگر اچھا نہیں لگتا

محبت میں وہ منزل بھی کبھی آتی ہے جب دل کو
اگر اچھا نہیں لگتا، مگر اچھا نہیں لگتا

ایک شعر

پڑتا ہے کبھی دل پہ کبھی ہاتھ جگر پر
شاید وہ مجھے رکھ کے کہیں بھول گیا ہے

علیہ السلام

خاموشی سے رہ لے سائیں
ہنس کر سب دکھ سہہ لے سائیں

بعد میں سب کچھ، بعد میں سب کچھ
پہلے تو ہے، پہلے سائیں

جی بہلا، بس جی بہلا لے
جیسے بھی جی بہلے سائیں

دنیا کیا کیا کہتی ہے جی
کہہ لے، تُو بھی کہہ لے سائیں

آن ملیں گے، آن میں ہم بھی
تھوڑی دُوری سہہ لے سائیں
تھوڑی سی تنہائی بچا لے
اپنے ساتھ بھی رِہ لے سائیں

جلدی مت کر سوچ سمجھ لے
پوچھ لے دل سے پہلے سائیں

دو شعر

رشتۂ جاں ہے تو اے جان بہانہ سہی
دوستانہ نہ سہی، تجھ سے حریفانہ سہی

جل کے بجھنا ہی مقدر ہے تو اے جانِ حیات
صورتِ شمع سہی صورتِ پروانہ سہی

علیہ السلام

یاد رکھے گی مجھ کو کیا تُو بھی
عیش کر یادِ یار جا تُو بھی

تُو بھی آئی تھی اُس کے کوچے سے
جا چلی جا، وہیں صبا تُو بھی

آج کے بعد سے ہے میرے لیے
مثلِ عمرِ گریز پا تُو بھی

تیرا شکوہ ، مرا گلہ بے سُود
بے وفا میں بھی، بے وفا تُو بھی

میں تجھے روکتا ہوں جانے سے
روک لے میرا راستہ تُو بھی

کیا سے کیا کر دیا مجھے تُو نے
ہو گئی جانے کیا سے کیا تُو بھی

اور بھی چارہ گر تھے میرے لیے
تھی مرے درد کی دوا تُو بھی

ناز اٹھاتی تھیں اور بھی کلیاں
گُل کی لیکن تھی ہم نوا تُو بھی

جا بجا تھا طلسمِ ہوش رُبا
اور جادو تھی جا بجا تُو بھی

کو بکو تھے ہزار قصۂ رنگ
انہی رنگوں میں تھی حنا تُو بھی

ایک سے بڑھ کے ایک تھی لذت

تھی الگ ایک ذائقہ تُو بھی

میں بھی تھا پہلے انتہاؤں پر
ابتدا میں تھی انتہا تُو بھی

ہو رہی ہے قدم قدم پر بھول
یاد آتی ہے جا بجا تُو بھی

اور تنہائی چپ چاپ روتی رہی

شام کی سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے
یاد کا پاؤں پھسلا

تو گرنے لگیں

خواب کی جیب سے

اَن گنت پرچیاں

اور ہم دیر تک جمع کرتے رہے

خود کو تفریق کرتی ہوئی دھجیاں

رات کی ملگجی روشنی میں کہیں

جو نظر آ رہا تھا

نہیں تھا،

دُور ساحل پہ کچھ روشنی تھی

اور

وہ بھی اندھیروں میں لپٹی ہوئی

ہاں مگر

شام کی سیڑھیوں پر

یاد کا سانس چلتا رہا دیر تک

شاعری،

درد کے اشک چُنتی رہی

اور تنہائی !

چپ چاپ روتی رہی

کچھ مجھے یاد آیا

تو میں رو دیا

کچھ اُسے یاد آیا

تو وہ ہنس دیا

ہم رشتۂ الفاظ و حروف

میں نے دیکھا ہے

نہ تم نے مجھے دیکھا ہے ابھی

ہم کہ لکھے گئے الفاظ کا

رشتہ ہیں ابھی

اور یہ رشتہء الفاظ

معانی کے بغیر

ایسے قائم ہے

کہ جیسے کوئی کردار

کہانی کے بغیر

ہم ابھی لفظ ہیں

جو برقی مشینوں کے طفیل

روز ملتے ہیں

بچھڑ جاتے ہیں

اپنی پہچان ہیں

دو چار چُنیدہ سے حروف

جن میں آمیزشِ اعداد بھی ہوسکتی ہے

اور یہ پہچان بھی محتاجِ حروف

چند مخفی سے چُنیدہ سے حروف،

چند مخفی سے چُنیدہ سے حروف
اِسمِ اعظم ہیں
اگر یاد نہ رہ پائیں تو ہم
زندگی بھر نہ کبھی ہوں گے بہم
اِس کا مطلب ہے کہ ہم کوئی نہیں
ہم فقط لفظ ہیں
جو برقی مشینوں کے طفیل
روز ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
اور اِن برقی مشینوں کا
بھروسہ بھی نہیں
جانے کب
کون سے لمحے میں
جدائی لکھ دیں
اِس لیے
اے مِرے ہم رشتۂ الفاظ وحروف

ہم بچھڑ جائیں

تو اِلزام نہ دینا مجھ کو

مرے وجود پہ ہے قرض

مرے وجود

اور

تیری کوکھ سے جڑی ہوئی
جو ڈور تھی
وہ کاٹ دی گئی تھی
جب مرے وجود نے
جنم لیا
مگر وہ ڈور آج بھی
بندھی ہوئی ہے
میرے پاؤں سے
یہ ڈور میری موت تک
مرے وجود پہ ہے قرض
تیری کوکھ کا

اماں چیختی رہ جاتیں

خوابوں کے بازار میں جاتے
میں اور میرے یار

ٹوٹی چپّل ہاتھ میں لے کر
سُتلی یا پھر کپڑے کی
بوسیدہ دھجّی ڈھونڈتے رہتے
گھومتے رہتے
بے مقصد، بے کار
شور شرابا، ہلا گلا،
دِھینگا مشتی کرتے رہتے
ہم میں سے دو چار
گِلّی ڈنڈہ، کنچے، پِٹھو، سر یا کھیلتے رہتے
اماں چیختی رہ جاتیں
اور ہم اپنی دُھن میں رہتے
شام ڈھلے جب گھر کو آتے
جو کچھ ملتا کھا لیتے
اور خاموشی سے سو جاتے
صبح کو گڑ اور چائے کی پتّی
لینے جب ہم جاتے

ہاتھ میں ٹوٹی چپل لے کر
سُتلی ڈھونڈتے رہتے
کاغذ کی پُڑیا سے پتّی
رستے میں گر جاتی
گڑ کا ڈلا بھی
ہاتھ سے گر کر کیچڑ میں مل جاتا
آنکھ میں آنسو لے کر
جب ہم ڈرتے ڈراتے
واپس گھر کو آتے
اماں کی بھی آنکھ میں آنسو
چپکے سے آ جاتے

آخری خواب

زندگی دائرہ ہے
دائرے میں کئی دائرے ہیں

دائرے ٹوٹتے ہی نہیں

کوئی تیشہ کہیں بھی نہیں

کون توڑے گا

اِن دائروں کو

کون نکلے گا

اِن دائروں سے

زندگی،

دائروں سے نکلنے کو بیتاب ہے

اور

شاید یہی آخری خواب ہے

اُلجھاوا

اَن گنت خواب ہیں

اُلجھاوے ہیں
سینکڑوں رنگ ہیں
رنگوں کی فُسوں کاری ہے
ہر قدم پر کئی پچھتاوے ہیں
تُو بھی شامل ہے
کسی خواب کے پچھتاوے میں
میں بھی اُلجھا ہوں
کسی رنگ کے اُلجھاوے میں

جو تھا، کہاں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا
مجھے گماں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

یہ قافلہ جو بظاہر رُکا ہُوا ہے کہیں
رواں دواں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

محال ہے اُسے ممکن سے کھینچ کر لانا
یقیں، گماں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

کہیں نہیں ہے، کہیں بھی نہیں ہے جس کا وجود
کہاں کہاں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا
وہ شاخِ گُل کہ لچکتی دکھائی دیتی ہے
کڑی کماں ہے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا

تین شعر

چار و ناچار سبھی آپ کی محفل سے اُٹھے
لوگ آسانی سے اور ہم بڑی مشکل سے اُٹھے

کتنے مجنوں تھے کہ بیٹھے تھے پسِ پردۂ خاک
کتنے پردے تھے کہ اِک پردۂ محمل سے اُٹھے

میں یہی سوچ کے تنہائی کے ساحل سے اُٹھا
جب بھی طوفان اُٹھے ہیں کسی ساحل سے اُٹھے

رہے گی کچھ دنوں یاری رہے گی
پھر اُس کے بعد بیزاری رہے گی

ہمارے یار کا تُو یار نکلا
میاں تجھ سے بھی اب یاری رہے گی

کسی کی ناز برداری کروں میں
تمہاری ناز برداری رہے گی

رہے گی اُس کی دل داری کسی سے
کسی سے میری دل داری رہے گی

ابھی وہ حُسن بیگانہ رہے گا
ابھی وہ آنکھ انکاری رہے گی

جدائی کا ابھی نشّہ رہے گا

یہ کیفیت ابھی طاری رہے گی

بہت دن یاد آئے گا ہمیں وہ
بہت دن تک یہ سرشاری رہے گی

محبت ختم ہو جائے گی اک دن
محبت کی اداکاری رہے گی

مجھے بھی صبر آجائے گا اک دن
اُسے بھی کب یہ دُشواری رہے گی

السلام علیہ

شکر ہے، ایک دن گزر گیا ہے
ایک دن، تیرے بِن گزر گیا ہے

دل کو عہدِ شباب تک لا کر
عرصۂ سال و سِن گزر گیا ہے

آنکھوں آنکھوں میں رات کٹ گئی ہے
باتوں باتوں میں دن گزر گیا ہے

دل کی آسودہ حالتوں کے بغیر
دل بہت مطمئن گزر گیا ہے

امتحاں ضبطِ شوق کا لے کر
دل سا اِک ممتحن گزر گیا ہے

علیہ السلام

یہ آنسوؤں کی روانی ! مزاج اچھے ہیں
بتاؤ کیا ہوا جانی مزاج اچھے ہیں

بُجھی بُجھی سی نظر آ رہی ہو خیر تو ہے
کہاں ہے شعلہ بیانی مزاج اچھے ہیں

یہ آج دن میں بھی خوشبو بکھیر دی تو نے
ارے او رات کی رانی مزاج اچھے ہیں

ارے یہ آتشِ سیّال ہے پیالے میں
یہ آگ اور یہ پانی مزاج اچھے ہیں

یہ آدھی رات میں یوسف کو تم زُلیخا کی
سنا رہی ہو کہانی، مزاج اچھے ہیں

بتاؤ کیا کوئی نِروان مل گیا ہے تمھیں
تم اور اتنی گیانی مزاج اچھے ہیں

نہ شوخیاں، نہ تبسّم، نہ زیرِ لب کوئی بات

نہ گفتگو میں روانی، مزاج اچھے ہیں

کہاں تھیں اتنے دنوں سے نظر نہیں آئیں
کہاں تھیں دلبرِ جانی، مزاج اچھے ہیں

ق

چھڑا رہے ہو زلیخائے وقت سے دامن
بنے ہو یوسفِ ثانی مزاج اچھے ہیں

اُلجھ رہے ہو کہاں نکتہ آفرینی میں
تلاشِ لفظ و معانی مزاج اچھے ہیں

علیہ السلام

مسجد ہے، قبلہ پیرِ مغاں خیریت تو ہے
اِس وقت آپ اور یہاں خیریت تو ہے

کیا دل کی بات آگئی کوئی زبان پر
کیوں لڑکھڑا رہی ہے زباں، خیریت تو ہے

ہر چند میکدے میں خدا کا گماں تو تھا
کیا وہم ہو گیا ہے گماں خیریت تو ہے

اس راہِ عاشقی میں یہ رندوں کو کیا ہُوا
اندیشہ ہائے سود و زیاں، خیریت تو ہے

کیا ہوش میں نہیں ہیں یہ رندانِ بے دماغ
کیا دے چکے ہیں دل کو زباں، خیریت تو ہے

شاید کسی غزال تمنا کا فیض ہے
غزلیں سُنا رہے ہو میاں خیریت تو ہے

تین شعر

یہ تم جو رات دن زخمِ شناسائی کو روتے ہو
محبت پوچھ کر کی تھی جو رُسوائی کو روتے ہو

ہمیں دیکھو ہمارے ضبط کا بندھن نہیں ٹوٹا
مگر تم ہو کہ اک چھوٹی سی تنہائی کو روتے ہو

محبت اک تماشہ ہے، یہ رُسوائی تو ہونی تھی
تماشے کو نہیں روتے ،تماشائی کو روتے ہو

اِتنی ذلّت تھی، اِتنی رُسوائی
موت تک پوچھنے نہیں آئی

کوئی ہمدم نہیں، رفیق نہیں
ایک لے دے کے صرف تنہائی

کھو گئے لوگ ایک اک کر کے
چھُٹ گئی ہم سے بزم آرائی

دل تھا بیمار ایک مدّت سے
اور بیمار تھی مسیحائی

جاتے جاتے نگاہ خود پہ پڑی
تہی دامن تھے، آنکھ بھر آئی

ایک خوشبو نجانے کب کیسے
خلوتِ خاص میں چلی آئی

کیا سے کیا ہوگیا محبت میں

اجنبی ہوگئی شناسائی

اُس کے ہونٹوں کو گنگنا کے چلی
آخری بار غم کی پُروائی

اُس کی آنکھوں کو مسکراتی رہی
اُس کے جانے کے بعد بینائی

اُس کی سانسوں کو لے بناتی رہی
نغمگی ہائے نغمہ آرائی

کہنے سننے کو کچھ بچا ہی نہیں
بس تماشہ ہے اور تماشائی

میرے سینے پہ اپنا سر رکھ کر
ہائے کیا کیا وہ زُلف لہرائی

عشق

میرؔ و غالبؔ نے سے

شاعری کس طرف کی آئی

عشق

میں اس نتیجے پہنچا ہوں ایک عمر کے بعد
ثنائے آلِ محمد ہے شاعری کیا ہے

نہیں کہ سینہء اربابِ کینہ محرمِ راز
برائے کم نظراں کب ہے صورتِ اعجاز
کُھلی ہے دوشِ تخیّل پہ اُس کی زلفِ دراز
وہ گفتگو ہے خموشی سے، جو کرے آغاز

سماعتوں کے سروں سے گزرنے والی ہے
نوائے عشق ہے، دل میں اُترنے والی ہے

نگاہِ عشق کی منزل نہیں رہے الفاظ
جوازِ گرمیء محفل نہیں رہے الفاظ
معانی خیزی میں کامل نہیں رہے الفاظ
نَفَس کُشائی کے قابل نہیں رہے الفاظ

صریرِ خامہ صدائے خیالِ عشق کہاں
خیالِ عشق بجائے خیالِ عشق کہاں
شِکوہِ عشق، سپردِ قلم نہیں ہوگا
وجود، راہیء مُلکِ عدم نہیں ہوگا
نہیں نہیں کہ یہ قصہ رقم نہیں ہوگا
قسم خدا کی، خدا کی قسم نہیں ہوگا

رَسا نہ ہو تو غمِ نارَسا لکھیں اُس کو

جو دل میں ہُوک سی اُٹھے تو کیا لکھیں اُس کو

فُسوں نہیں ہے کہ نذرِ ایاغ ہو جائے
خزاں نہیں ہے کہ دُودِ چراغ ہو جائے
نہ آہِ سرد کہ سینے میں داغ ہو جائے
خرد نہیں ہے کہ صیدِ دماغ ہو جائے

شعاعِ مہرِ تخیّل کی حد سے باہر ہے
حدودِ عقل سے، طوقِ خرد سے باہر ہے

چمک اُٹھے جو نگاہوں میں عشق کی شمشیر
ہلاکِ جنبشِ مژگاں ہو ناخنِ تدبیر
مٹا کے آئینہ خانے سے خواب کی تصویر
تخیلّات کے پیروں میں ڈال دے زنجیر

مآلِ عشق سے جو بہرہ مند ہو جائے

دماغِ کون و مکاں سے بلند ہو جائے

کُھلا ہے پرچمِ دل، چشمِ دل کو وا کیجئے
حقوقِ عشق بہ حسنِ ادا، ادا کیجئے
نگاہِ شوق کو کچھ اور آئینہ کیجئے
حریمِ نازِ عقیدت ہے ابتدا کیجئے

سفر وہ ہے کہ بظاہر کوئی خِرام نہیں
سکوت ایسا کہ جس میں کوئی کلام نہیں

حریفِ گردشِ دوراں کی ابتدا کو سلام
کلام جس میں نہیں ایسی انتہا کو سلام
حیات مندی و تہذیبِ اِرتقا کو سلام
جو حق شناس ہے، اُس عقلِ ماورا کو سلام

رَموزِ عشق کے اَسرار کھول دے یارب

قبائے حُسنِ طرحدار کھول دے یارب

نشاط و کیفِ مسلسل یہ بندگی کیوں ہے
یہ اعتبار، یہ لذّت، یہ آگہی کیوں ہے
قیاس و وہم سے آگے یہ زندگی کیوں ہے
یقیں کے غارِ حرا میں یہ روشنی کیوں ہے

محیطِ کون و مکاں کس کی تاب ناکی ہے
یہ کیسا نور ہے، جس سے یہ خواب ناکی ہے

بساطِ عقل اُلٹنے کا فلسفہ کیا ہے
شعور مندی و اِدراک و ماسوا کیا ہے
خمیرِ عشق کی دراصل کیمیا کیا ہے
خبر تو ہو، کہ حقیقت میں ماجرا کیا ہے

تغیرات و حوادِث میں جاودانی ہے

یہ بحرِ عشق میں کس چیز کی روانی ہے

وہ کیا نشاط ہے، جس میں ملالِ ہجر نہیں
وہ کیا نظر ہے کہ جس میں سوالِ ہجر نہیں
وہ وصل کیا ہے کہ جس میں مجالِ ہجر نہیں
وہ کیا خیال ہے، جس میں خیالِ ہجر نہیں

ملالِ سود و زیاں سے فزوں نہیں ہے عشق
خلش فروز نہیں ہے، تو کیوں نہیں ہے عشق

بہارِ دہر سے پہلو بچا کے چلتا ہے
نظر جھکا کے نہیں، سر اُٹھا کے چلتا ہے
جبیں پہ شوق کے سجدے سجا کے چلتا ہے
عمل کی راہ میں سر کو جھُکا کے چلتا ہے

بجز خدا و خودی ذوقِ آشنائی نیست

نہ دانم از چہ سبب رنگِ بے وفائی نیست

نگار خانہ ہستی سے کج اَدائی کیا
اَدائے عشقِ زُلیخا سے بے وفائی کیا
چمن میں رہ کے گلوں سے گریز پائی کیا
کسی جہانِ شُنیدہ سے آشنائی کیا

جہانِ تازہ سے بیگانگی نہیں کھُلتی
کھُلا کہ عشق، تری آگہی نہیں کھُلتی

نہ اضطراب، نہ وحشت، نہ چاک دامانی
نہ کوئی وہم، نہ دھڑکا، نہ کوئی حیرانی
نہ کوئی خواب، نہ حسرت، نہ فکرِ سلطانی
رہی جو عشق کو لاحق تو یہ پریشانی

کہ اے کریم بتا ! تیرا مدّعا کیا ہے

سوال یہ ہے کہ مالک تری رضا کیا ہے

خرد کی فلسفہ دانی سنی تو ہنس کے کہا
فروغِ دہر و مکافاتِ زندگی پہ نہ جا
مری تلاش اگر ہے، تو سُن ازل کی صدا
ابد کے خواب کی تعبیر دیکھنی ہے تو آ

یہ دیکھ نورِ الٰہی کا نور ہے مجھ میں
غیاب میں بھی مسلسل ظہور ہے مجھ میں

جو اہلِ عشق ہیں دنیا کی اُن کو حاجت کیا
کہ اُن کے فقر کے آگے جہاں کی دولت کیا
وجودِ عشق کو لاحق عدم کی صورت کیا
اِس آئینے کو کسی عکس کی ضرورت کیا

جو بے نیاز ہے اُس سے نیاز رکھتے ہیں

یہ اہلِ عشق ہیں، اپنا جواز رکھتے ہیں

یہ چشمِ عشق حقیقت کا راز جانتی ہے
مُشیرِ نفس ہے، راز و نیاز جانتی ہے
ضمیرِ کُن ہے، نشیب و فراز جانتی ہے
شمیمِ اصل ہے ہنگامہ ساز، جانتی ہے

تجلّیاتِ الٰہیٰ کا سلسلہ ہے عشق
بَلا نہیں ہے مری جان، کربلا ہے عشق

بہ فیضِ عشق ہی اسرارِ کائنات کھُلے
بہ فیضِ دل ہی دلوں کے معاملات کھُلے
نسیمِ صبح کھُلی، روزنِ حیات کھُلے
کھُلی جو چشمِ حقیقت رموزِ ذات کھُلے

کھُلا کہ بندِ قبا عشق ہی سے کھُلتا ہے

اگر کھُلے تو خدا، عشق ہی سے کھُلتا ہے

نہیں تھا عشق، تو آدابِ بندگی بھی نہ تھے
جو سجدہ ریز تھے مائل بہ آگہی بھی نہ تھے
وہ تیرگی تھی، طلب گارِ روشنی بھی نہ تھے
حیات تھی، مگر آثارِ زندگی بھی نہ تھے

نجوم و آتش و خورشید کی خدائی تھی
خود اپنے وعدہ و پیماں سے بے وفائی تھی

تھی جس کے ہاتھ میں طاقت وہی سکندر تھا
ہزار ننگِ تعقل تھا، جو بھی منظر تھا
عقب میں دشت تھا اور سامنے سمندر تھا
اور اُن کے بیچ میں انسان کا مقدّر تھا

اگرچہ خلق میں فتنہ فساد جاری تھا

جو اہلِ عشق تھے، اُن کا جہاد جاری تھا

کبھی کہا کہ خدا ہی بزرگ و برتر ہے
کبھی کہا کہ حزیمت سے موت بہتر ہے
کبھی کہا کہ یہ دنیا بڑی ستم گر ہے
کبھی کہا کہ فنا خاک کا مقدّر ہے

نمازِ عشق ادا کی تو مختصر نہ ہوئی
کہ تیر پاؤں سے کھینچا مگر خبر نہ ہوئی

ملا جو حکم، حبیبِ خدا بجا لائے
وفا سرشت تھے، عہدِ وفا اُٹھا لائے
بس ایک دل تھا، جسے عشق سے سجا لائے
خبیرِ عشق تھے، آئے، تو وہ اَدا لائے

کہ دشمنوں کی نگاہوں میں دھول جانے لگی

علی کے جسم سے بُوئے رسول آنے لگی

کُھلی جو آنکھ تو آغوشِ مصطفٰی میں کُھلی
شمیمِ عشق تھی، معشوقِ کبریا میں کُھلی
وجودِ حق کی گواہی تھی، ابتدا میں کُھلی
بہارِ عشق کی نکہت تھی، کربلا میں کُھلی

فلک کی آنکھ میں جو انتخاب ہوتے ہیں
شہیدِ عشقِ رسالت مآب ہوتے ہیں

ستم کہ بیعتِ فاسق کا جب سوال اُٹھا
کوئی جری نہ بہادر پئے جدال اُٹھا
مِلا کے ظلم سے آنکھیں، وہ خوش خِصال اُٹھا
اُٹھا وہ حشر کہ دیکھو علی کا لال اُٹھا

جلالِ عشق کی ہیبت جو آشکار ہوئی

فلک کے سائے میں جنبش تہہِ مزار ہوئی

کڑا تھا وقت مگر مضطرب نہ تھے شبّیر
کہ اُن کے صبر کو وحشت نہ تھی کبھی اکسیر
سُنانے آئے جو اہل حرم کو مکرِ شریر
نگاہ کرتے تھے سوئے فلک دمِ تقریر

صلاح کار جو اہلِ حرم سے ہوتے تھے
کلیجہ تھام کے منہ پھیر پھیر روتے تھے

حبیب ابن مظاہر کو جب خبر یہ ہوئی
جگر میں درد اٹھا، سینے میں چھری سی چلی
چلا جو حق کی طرف وہ حبیبِ ابنِ علی
ندا وہ آئی کہ کھِلنے لگی تھی دل کی کلی

ہے خوش نصیب کہ جو دل سے دل پروتا ہے

جو آڑے وقت میں کام آئے، دوست ہوتا ہے

درِ حُسین پہ دستک جو آشنا سی ہوئی
سمجھ گئے کہ خبر یہ حبیب کو بھی ہوئی
کواڑ کھول دیئے اور نگاہ بوسی ہوئی
تھما جو سانس، تو باہم مزاج پُرسی ہوئی

نگاہِ عشق سے اپنے اثر میں لائے حُسین
سہارا دے کے اُنہیں اپنے گھر میں لائے حُسین

کہا حبیب نے نظریں جھکا کے، حق کے طبیب
سُنی ہے میں نے ابھی یہ خبر عجیب و غریب
لگایا سینے سے اُن کو، کہا بٹھا کے قریب
کہ تم تو دوست ہو، اب تم سے کیا چھپائیں حبیب

ہمارے ساتھ چلو گے تو جاں سے جاؤ گے

پلٹ کے اپنے عزیزوں میں آ نہ پاؤ گے

یہ سن کے اشک فشاں ہو گئے حبیبِ حُسین
اُنہیں ملال سے تکنے لگے نجیبِ حُسین
سرک کے اور ذرا ہوگئے قریبِ حُسین
لبوں پہ لائے بمشکل سخن خطیبِ حُسین

حسین آپ نے کیا ہم کو غیر جانا ہے
پلٹ کے اپنے عزیزوں میں کس کو آنا ہے

رہی ہیں آپ سے دیرینہ قربتیں اپنی
کھُلی تو آپ پہ ہوں گی محبتیں اپنی
زمانہ ہو گیا، بدلی نہ چاہتیں اپنی
ثنائے آلِ محمد ہے راحتیں اپنی

سوائے آپ کے ہم کس کی بات مانتے ہیں

حُسین آپ تو میرا مزاج جانتے ہیں

مجھے حبیب کہا آپ کی عنایت ہے
یہ فخر میرے لیے باعثِ مسرت ہے
متاعِ عمر ہے، اعزازِ آدمیت ہے
مگر حُسین یہ سب آپ کی محبت ہے

رفیق آپ نے مجھ کو مُدام سمجھا ہے
غلام نے تو ہمیشہ امام سمجھا ہے

امام جو بھی کہے اُس سے کیا مفر کیجئے
حُسین مجھ پہ عنایت کی اِک نظر کیجئے
خطا جو مجھ سے ہوئی ہو تو درگزر کیجئے
مجھے بھی ہمسفر کیجئے، اگر سفر کیجئے

غلام بی بی سکینہ کے کام آئے گا

مرا بھی حق کے شہیدوں میں نام آئے گا

سفر تمام ہُوا کربلا میں آئے حُسین
حبیب ابنِ مظاہر نے لی بَلائے حُسین
چلی جو دشت و بیابان میں ہَوائے حُسین
تو گونجنے لگی صحرا میں یہ صدائے حُسین

نہیں کہ بیعتِ فاسق ہمیں قبول نہیں
کہ یہ وقارِ جگر گوشۂ رسول نہیں

گئی جو شام کے دربار میں سحر کی خبر
تو کانپنے لگے ایوانِ ظلم و بانیء شر
کہا یہ شمر نے غصّے میں آکے بارِ دگر
نہ کی حُسین نے بیعت، تو کاٹ لاؤں گا سر

سُنا یزید نے جب یہ تو مسکرانے لگا

غرورِ ناز سے پیٹھ اُس کی تھپتھپانے لگا

پئے جدال اُدھر سے جو فوجِ شام آئی
ہجومِ غم میں اِدھر مضطرب تھی تنہائی
اِدھر تھا سازِ غمِ دل، اُدھر تھی شہنائی
فروغِ ظلم کی چلنے لگی جو پُروائی

حبیب ابنِ مظاہر خیام سے نکلے
مگر اجازتِ عالی مقام سے نکلے

چلا جو بہرِ وغا جانثارِ ابنِ علی
نہ تھا قرار کی حد میں قرارِ ابنِ علی
گیا تو لے گیا، ساری بہارِ ابنِ علی
لڑا تو جم کے لڑا، اعتبارِ ابنِ علی

اگرچہ ضعف سے لرزہ بدن پہ طاری تھا

مگر وہ پیر ہزاروں جواں پہ بھاری تھا

لگا جو تیر تو سینے پہ ہاتھ رکھ کے کہا
حُسین آپ کی چاہت کا حق ادا نہ ہُوا
وغا کا شوق ابھی ہو نہیں سکا پورا
حُسین بہرِ مدد آیئے کہ میں تو چلا

حُسین آخری دیدار تو کرا دیجے
حُسین آپ کہاں ہیں مجھے صدا دیجے

گئے حُسین جو دل تھام کے حبیب کے پاس
بہ فرطِ جوشِ محبت، بہ شدّتِ احساس
ابھی حبیب میں باقی تھی گرمیٔ انفاس
ابھی تو سانس کی ڈوری سے منسلک تھی آس

رُخِ حسین کو دیکھا تو دم کو توڑ دیا

مورخین نے اپنے قلم کو توڑ دیا

رفیقِ حضرتِ شبیر کی جدائی ہے
یہ ایک خواب سے تعبیر کی رہائی ہے
گھڑی حُسین پہ کیسی یہ آج آئی ہے
نہ ہمدمی ہے کوئی، اور نہ ہمنوائی ہے

ہجومِ یاس میں جب یادِ رفتگاں آئی
صدائے دوست سے آوازِ دوستاں آئی

علیہ السلام

ہو خدا حامی و ناصر، شب بخیر

کوچۂ دل کے مسافر، شب بخیر

آہ تُو نے سیر ہی دل کی نہ کی
ہائے کیا کیا تھے مناظر، شب بخیر

اے خلش، اے غم گسارِ جان و دل
شب بخیر اے جنسِ نادر، شب بخیر

آپ کے آنے سے رونق آئی تھی
جارہے ہیں آپ آخر، شب بخیر
خالی خالی لگ رہی ہے زندگی
کی نہیں جی بھر کے خاطر، شب بخیر

الوداع اے حرفِ اوّل الوداع
الوداع اے حرفِ آخر، شب بخیر

ہوچکی، ہونی تھی جتنی شاعری
اے شبِ گریہ کے شاعر، شب بخیر

علیہ السلام

تسبیح و سجدہ گاہ بھی سجدہ بھی مست مست

قبلہ بھی مست مست ہے، کعبہ بھی مست مست

قطرہ بھی اپنی موج میں، دجلہ بھی موج میں
دریا بھی مست مست ہے، صحرا بھی مست مست

خورشید و ماہتاب بھی ذرّہ بھی بے دماغ
ادنیٰ و پست و ارفع و اعلیٰ بھی مست مست

میرا وجود اور وجودِ عدم بھی مست
پنہاں بھی مست مست ہے، پیدا بھی مست مست

آئینہ، عکس اور پسِ آئینہ بھی مست
پوشیدہ مستِ خواب، ہویدہ بھی مست مست

عالی جناب قبلہ و کعبہ حضورِ من!
میں ہی نہیں ہوں قبلہ و کعبہ بھی مست مست

مطلعِ ثانی

ساغر، صراحی، جام، پیالہ بھی مست مست
ساقی بھی مست مست ہے صہبا بھی مست مست

یخ بستگی بھی مست ہے اور آہِ سرد بھی
چنگاری، آگ، آگ کا شعلہ بھی مست مست

اے بے خودی سلام تجھے، تیرا شکریہ
دنیا بھی مست مست ہے عقبیٰ بھی مست مست

کچھ تیری مدھ بھری ہوئی آنکھیں بھی مست ہیں
کچھ ان کے ساتھ ساتھ زمانہ بھی مست مست